مولانا ابوالکلام آزادؒ

شاہین بک سینٹر

۹/۵۵۳۹ پرانا سیلم پور دہلی ۱۱۰۰۳۱

واقعات اصحاب کہف ذوالقرنین

اصحاب کہف

ذوالقرنین

بار اوّل ۱۹۸۶ء

ناشر محمد اقبال

تعداد ایک ہزار

قیمت سترہ روپئے 17/=

پریس خواجہ پریس جامع مسجد دہلی

سول ایجنٹ برائے کشمیر

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز

گاؤ کدل چوک۔ ایکس چینج روڈ

سری نگر

خلاصہ

سورہ کہف آیت ۹ سے اصحاب کہف کی سرگزشت شروع ہوئی. فرمایا۔
یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے اللہ کی رحمت پر بھروسہ کیا تھا اور ایک پہاڑ کے غار میں جا چھپے تھے. کئی برسوں تک یہ اس میں پوشیدہ رہے آبادی سے ان کا کوئی علاقہ نہیں رہا۔ زندگی کی کوئی صدا ان کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی پھر وہ اٹھائے گئے یعنی ظاہر ہوئے اور یہ سارا معاملہ اس لئے ہوا کہ واضح ہو جائے دونوں جماعتوں میں سے کون سی جماعت ایسی تھی جو وقت کے واقعات اور ان کے نتائج کا بہتر اندازہ کر سکتی تھی۔

دو جماعتوں سے مقصود اصحاب کہف اور ان کی قوم و ملک کے لوگ ہیں۔
گویا اس تمام معاملے کا ماحصل ہے۔ اس کے بعد اس کی ضروری تفصیلات آتی ہیں، چنانچہ آیت نمبر ۱۳ میں فرمایا" نحن نقص علیک نبأھم بالحق "

الف

ایک گمراہ اور ظالم قوم سے چند حق پرست نوجوان کا کنارہ کش ہو جانا اور ایک پہاڑ کے غار میں جا کر پوشیدہ ہو جانا۔ ان کی قوم چاہتی تھی انہیں سنگسار کر دے۔
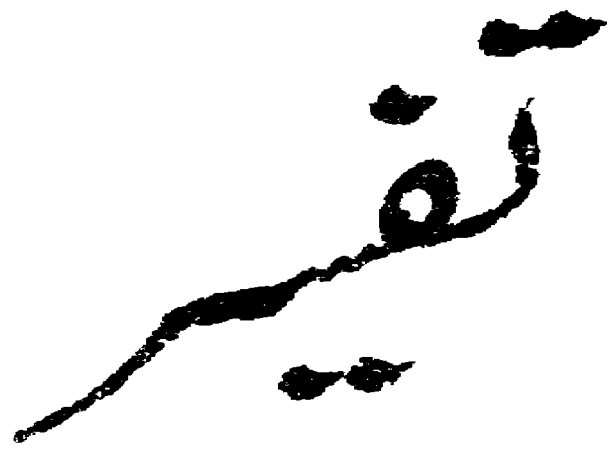
یا جبراً اپنے دین میں واپس لے آئے انہوں نے دنیا چھوڑ دی مگر حق سے منہ نہ موڑا۔

(ب)

جب وہ غار میں اٹھے تو اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ کتنے عرصہ تک یہاں رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک آدمی شہر میں کھانا لانے کے لئے بھیجا اور کوشش کی کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ لیکن حکمتِ الٰہی کا فیصلہ دوسرا تھا۔ خبر ہو گئی اور یہ معاملہ لوگوں کے لئے تذکیر و عبرت کا موجب ہوا۔

(ج)

جس قوم کے ظلم سے عاجز ہو کر انہوں نے غار میں پناہ لی تھی، وہی ان کی اس درجہ معتقد ہوئی کہ ان کے مرقد پر ایک ہیکل تعمیر کیا گیا۔

(د)

اس واقعہ کی تفصیلات لوگوں کو معلوم نہیں۔ طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئی ہیں بعض کہتے ہیں وہ تین آدمی تھے۔ بعض کہتے ہیں پانچ تھے بعض کہتے ہیں سات تھے مگر یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔ حقیقت حال اللہ ہی کو معلوم ہے اور غور کرنے کی بات یہ نہیں ہے کہ ان تعداد کتنی تھی ؟ دیکھنا چاہیئے کہ اُن کی حق پرستی کا کیا حال تھا؟

الرقیم

لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ "رقیم" وہی لفظ ہے جسے تورات میں "راقیم" کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر "پیٹرا" کے نام سے مشہور ہوا اور عرب اسے "البطرا" کہنے لگے۔

عالمگیر جنگ کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلے ان میں ایک پیٹرا بھی ہے اور اس کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کر لیا ہے۔

جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو دو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں، اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے یہ علاقہ نبطی قبائل کا علاقہ تھا اور اسی کی ایک پہاڑی سطح پر "راقیم" نامی شہر آباد تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا، تو یہاں کے دوسرے شہروں کی طرح راقیم نے بھی ایک رومی نو آبادی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہی زمانہ ہے جب پیٹرا کے نام سے اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹروں کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ ۶۳۰ء میں جب مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو راقیم کا نام بہت کم زبانوں پر رہا۔ یہ رومیوں کا پیٹرا اور عربوں کا البطرا تھا۔ جنگ کے بعد سے اس علاقے کی از سر نو اثری پیمائش کی جا رہی تھی اور

اصحابِ کہف

مسیحی مذہب کے ابتدائی قرنوں میں متعدد واقعات ایسے گزرے ہیں کہ راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے مخالفوں کے ظلم و دہشت سے عاجز آکر پہاڑوں کے غاروں میں پناہ لے لی اور آبادیوں سے کنارہ کش ہوگئے۔ یہاں تک کہ وہیں وفات پاگئے اور ایک عرصہ کے بعد اُن کی نعشیں برآمد ہوئیں چنانچہ ایک واقعہ خود روم کے اطراف میں گزرا تھا۔ ایک انطاکیہ کی طرف منسوب ہے، ایک افسس میں بیان کیا جاتا ہے۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سورہ میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ کہاں پیش آیا تھا۔؟

قرآن نے "کہف" کے ساتھ "الرقیم" کا لفظ بھی بولا ہے اور بعض ائمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے۔ لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا۔ اس لئے اکثر مفسر اس طرف چلے گئے کہ یہاں "رقیم" کے معنی کتابت کے ہیں۔ یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگا دیا گیا تھا، اس لئے کتبہ والے مشہور ہوگئے۔

نبطیوں کی وہاں آبادی تھی۔ اور نبطیوں کے تجارتی قافلے برابر حجاز میں آتے رہتے تھے یقیناً نبطیوں میں اِس واقعہ کی شہرت ہوگی ۔ اور انہی سے عربوں نے سنا ہوگا۔

خود قریش مکہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے۔ اور سفر کا ذریعہ وہی شاہراہ تھی جو رومیوں نے ساحلِ خلیج سے لے کر ساحلِ مارمورا تک تعمیر کردی گئی تھی [۱] پیٹرا اسی شاہراہ پر واقع تھا بلکہ اِس نواح کی سب سے پہلی تجارتی منڈی تھی اس لئے اِس سے زیادہ قدرتی بات کیا ہوسکتی ہے کہ یہ واقعہ ان کے علم میں آگیا ہو۔

اس سلسلہ میں چند باتیں اور تشریح طلب ہیں ۔

---

[۱] جنگ کے بعد اس شاہراہ کا سراغ لگایا گیا تو پوری طرح نمایاں ہوگئی، اب یہ اپنے اصلی خط پر دوبارہ تعمیر کی جارہی ہے اور عقبہ سے عمان تک تعمیر ہوچکی ہے۔ آج کل جہاں عقبہ ہے وہاں پہلے ترسیس آباد تھا، جہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے اور بحر احمر کے تجارتی بیڑے کا مرکز تھا۔

نئی نئی باتیں روشنی میں آرہی ہیں۔ ازاں جملہ اس علاقے کے عجیب وغریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں اور نہایت وسیع ہیں نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقعہ ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی ایک غار ایسا بھی ملا ہے جس کے دہانہ کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں شناخت کی گئی ہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معبد ہوگا جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام "الرقیم" بتلا دیا ہے اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں تکلفات کئے جائیں اور بغیر کسی بنیاد کے اسے "کتبہ" پر محمول کیا جائے۔

علاوہ بریں دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

قرآن نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کی عرب میں شہرت تھی لوگ اس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے اور اسے ایک نہایت ہی عجیب وغریب بات تصور کرتے تھے اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکین عرب کے وسائل معلومات محدود تھے۔ بہت کم امکان ہے کہ دور کی باتیں ان کے علم میں آئی ہوں۔ پس ضروری ہے کہ یہ قرب وجوار ہی کی بات ہو اور ان لوگوں کی زبانی سنی جا سکے جن سے ہمیشہ عربوں کا ملنا جلنا رہتا ہو۔ ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے؟ اگر اسے پیٹرا کا واقعہ قرار دیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اوّل تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا یعنی عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر تھا نیز

خدایا، تیری رحمت کا آسرا ہے اور تیری ہی چارہ سازی کا بھروسہ!" چنانچہ کئی سال تک وہ وہیں رہے اور اس طرح رہے کہ دنیا کی صداؤں کی طرف سے ان کے کان بالکل بند تھے۔ پھر ہم نے انہیں اٹھا کھڑا کیا۔ تاکہ واضح ہو جائے ان دونوں جماعتوں میں سے کون گروہ تھا۔ جس نے اس عرصہ میں نتائج عمل کا بہتر اندازہ کیا ہے؟ یعنی صورتِ حال نے دو جماعتیں پیدا کر دی تھیں ایک اصحابِ کہف تھے۔ ایک اُن کے مخالف۔ ایک نے حق کی پیروی کی دوسرے نے ظلم و تشدد پر کمر باندھی یہ چند برسوں کی مدت دونوں جماعتوں پر گزری تھی۔ اُس پر بھی جو غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی اور اُس پر بھی جس نے غار میں پناہ لینے پر انہیں مجبور کیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دونوں میں سے کس نے کمایا ہے؟ اور کس نے کھویا ہے؟ کون ان دونوں میں وقت کا بہتر اندازشناس تھا۔؟

چنانچہ آگے چل کر جو تفصیلات آتی ہیں ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظالم جماعت کے ظلم کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ اور بالآخر وہی راہ فتح مند ہونے والی تھی۔ اصحابِ کہف نے اختیار کی تھی۔ کیونکہ بالآخر مسیحی دعوت تمام ملک میں پھیل گئی اور جب کچھ عرصہ کے بعد وہ غار سے نکلے اور ایک آدمی کو آبادی میں بھیجا تو اب مسیحی ہونا کوئی ناقابل معافی جرم نہیں تھا۔ عزت و سربراہی کی سب سے بڑی عظمت تھی۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان پرستارانِ حق کی استقامت ہی تھی جس نے دعوتِ حق کو فتح مند کیا۔ اگر وہ مظالم سے تنگ آکر اتباع حق سے دست بردار ہو جاتے تو یقیناً یہ انقلاب ظہور میں نہیں آتا۔

اصل واقعہ

(۱) آیت (۹) "ام حسبت ان اصحاب الکہف والرقیم کانوامن ایا تنا عجبًا ؟" کا اسلوبِ خطاب صاف کہہ رہا ہے کہ کچھ لوگ اصحاب الکہف والرقیم" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا معاملہ قدرتِ الٰہی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں نے پیغمبر اسلام سے ان کا ذکر کیا ہے اور اب وحیِ الٰہی اس معاملہ کی حقیقت واضح کررہی ہے۔ چنانچہ پہلے مجملاً اس کا خلاصہ اور نتیجہ بتلادیا کہ جو کچھ پیش آیا تھا وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو کچھ عبرت و تذکیر کی بات ہے وہ یہ ہے۔ پھر آیت (۱۳) میں فرمایا "نحن نقص علیك نبأهم بالحق" اب ہم تجھے ان کی سچی خبر سنادیتے ہیں، یعنی کی چند ضروری تفصیلات بیان کردیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد تفصیلات بیان کی ہیں۔

یہ مجمل خلاصہ جو آیت نمبر (۱۰) سے (۱۲) تک بیان کیا ہے تمام سرگزشت کا ماحصل ہے۔ اسی کی روشنی میں بقیہ تفصیلات پڑھنی چاہئیں فرمایا:

چند نوجوان تھے جنہوں نے سچائی کی راہ میں دنیا اور دنیا کی راحتوں سے مونہہ موڑا اور ایک غار میں پناہ گزیں ہوگئے اُن کے پیچھے ظلم وستم کی تو تلواریں تھیں، سامنے غار کی تاریکی، وحشت تاہم وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا

کشادہ ہے۔ جگہ کی کمی نہیں۔ دوسری یہ کہ باہر سے دیکھنے والوں کے لئے اندر کا منظر بہت ڈراونا ہو گیا ہے۔ کیونکہ روشنی کے منافذ موجود ہیں اس لئے بالکل اندھیرا نہیں رہتا۔ سورج کسی وقت بھی سامنے آتا نہیں اس لئے بالکل اجالا بھی نہیں ہوتا۔ روشنی اور اندھیرے کا ملی جلی حالت رہتی ہے اور جس غار کی اندرونی فضا ایسی ہو اسے باہر سے جھانک کر دیکھا جائے تو اندر کی ہر چیز ضرور ایک بھیانک منظر پیش کرے گی۔

یہ لوگ کچھ عرصہ تک غار میں رہے۔ اس کے بعد نکلے تو انہیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ کتنے عرصہ تک اس غار میں رہے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے باشندوں کا وہی حال ہو گا۔ جس حال میں انہیں۔ لیکن اس عرصہ میں یہاں انقلاب ہو چکا تھا اب غلبہ ان لوگوں کا تھا جو اصحاب کہف ہی کی طرح خدا پرستی کی راہ اختیار کر چکے تھے۔ جب ان کا ایک آدمی شہر میں پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اب وہی لوگ جنہوں نے انہیں سنگسار کرنا چاہا تھا۔ ان کے ایسے معتقد ہو گئے کہ اُن کے غار نے زیارت گاہِ عام کی حیثیت اختیار کر لی اور امراءِ شہر نے فیصلہ کیا کہ یہاں ایک ہیکل تعمیر کیا جائے۔

(ج) اصحابِ کہف نے یہ مدت کس حال میں بسر کی تھی؟ اس بارے میں قرآنِ حکیم نے صرف اس قدر اشارہ کیا کہ "فضربنا علیٰ اٰذانھم فی الکھف سنین عددا (۱۱)" ضرب علی الآذان کے صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے یعنی دنیا کی کوئی صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی لیکن مفسرین نے اسے نیند پر محمول کیا ہے یعنی اُن پر نیند طاری ہو گئی تھی اور چونکہ نیند کی

(ب) اس کے بعد واقعہ کی بعض تفصیلات واضح کردی ہیں جو لوگ خدا پرستی کی راہ اختیار کرتے تھے ان کی مخالفت میں تمام باشندے کمربستہ ہوجاتے اور اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آتے تو سنگسار کرتے۔ یہ حالت دیکھ کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ آبادی سے مونہہ موڑیں اور کسی غار میں معتکف ہوکر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائیں۔ چنانچہ ایک غار میں مقیم ہوگئے۔

غار کی نوعیت

ان کا ایک وفادار کتا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ غار میں چلا گیا جس غار میں انھوں نے پناہ لی۔ وہ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اگرچہ اندر سے کشادہ ہے اور دہانہ کھلا ہوا۔ لیکن سورج کی کرنیں اس میں راہ نہیں پا سکتیں نہ چڑھتے دن میں نہ ڈھلتے دن میں جب سورج نکلتا ہے تو داہنی جانب رہتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ جب ڈھلتا ہے تو بائیں جانب رہتے ہوئے غروب ہوجاتا ہے۔ یعنی غار اپنے طول میں شمال وجنوب رویہ واقع ہے۔ ایک طرف دہانہ ہے۔ دوسری طرف منفذ۔ روشنی اور ہوا دونوں طرف سے آتی ہے لیکن دھوپ کسی طرف سے بھی راہ نہیں پا سکتی۔

اس صورت حال سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک یہ کہ زندہ رہنے کے لئے وہ نہایت موزوں اور محفوظ مقام ہے کیونکہ ہوا اور روشنی کی راہ موجود ہے مگر دھوپ کی تپش نہیں پہنچ سکتی پھر اندر سے

(د) آیت ۱۸: "تحسبھم ایقاظا وھم رقود" میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو نزول قرآن کے وقت تھی یا جو حالت اس غار کی ایک مدت تک رہی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انقلاب حال کے بعد اصحابِ کہف نے غار کی گوشہ نشینی ترک نہیں کی تھی۔ اسی میں رہے۔ یہاں تک کہ انتقال کر گئے ان کے انتقال کے بعد غار کی حالت ایسی ہو گئی کہ باہر سے کوئی دیکھے تو معلوم ہو زندہ آدمی موجود ہیں دہانے کے قریب ایک کتا دونوں ہاتھ آگے کئے بیٹھا ہے حالانکہ نہ تو آدمی زندہ ہیں نہ کتا ہی زندہ ہے۔

لیکن باہر سے دیکھنے والا انہیں زندہ اور جاگتا کیوں سمجھے؟ اگر ان کی نعشیں پڑی ہیں تو نعشوں کو کوئی زندہ تصور نہیں کر سکتا۔

اگر "رقود" سے مقصود سونے کی حالت ہے اور وہ لیٹے ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک لیٹا ہوا آدمی دیکھنے والے کو جاگتا ہی دکھائی دے۔

مفسرین نے یہ اشکال محسوس کیا لیکن اس کا کوئی حل دریافت نہ کر سکے بعضوں نے کہا وہ اس لئے جاگتے دکھائی دیتے ہیں کہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں لیکن اگر ایک بے حس و حرکت نعش پڑی دکھائی دے اور اس کی آنکھیں کھلی ہوں تو دیکھنے والا اسے ہوشیار و بیدار کیوں سمجھنے لگا؟ وہی سمجھے گا کہ مر گیا ہے مگر آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ بعضوں نے کہا "نقلبھم ذات الیمین و ذات الشمال" کی وجہ سے وہ بیدار دکھائی دیتے ہیں یعنی چونکہ وہ داہنے بائیں کروٹ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے دیکھنے والا خیال کرتا ہے یہ بیدار ہیں لیکن یہ تو وہ پہلے ہی کہہ چکی

حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا۔ اس لئے اس حالت کو "ضرب علی الآذان" سے تعبیر کیا گیا۔ اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کے لئے "ضرب علی الآذان" کی تعبیر ملتی نہیں لیکن وہ کہتے ہیں، یہ ایک طرح کا استعارہ ہے گہری نیند کی حالت کو ضرب علی الآذان کی حالت سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ ففی الکلام تجوز بطریق الاستعارہ التبعیہ۔

اصل یہ ہے کہ اصحاب کہف کا جو قصہ عام طور پر مشہور ہو گیا تھا، وہ یہی تھا کہ غار میں برسوں تک سوئے رہے۔ اس لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ بعد کو بھی اس کی روایتیں مشہور ہو گئیں عرب میں قصہ کے اصل راوی شام کے بنطی تھے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس قصہ کی اکثر تفصیلات تفسیر کے انہی راویوں پر جا کر منتہی ہوتی ہیں جو اہل کتاب کے قصوں کی روایت میں مشہور ہو چکے ہیں مثلاً ضحاک اور رسدی بہر حال اگر یہاں ضرب علی الآذان سے مقصود نیند کی حالت ہو، تو پھر مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے اور ثم بعثنا ھم کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے۔

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے۔ طبی تجارت کے مسلمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربے میں آتی رہتی ہیں پس اگر اصحابِ کہف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں۔ البتہ قرآن حکیم کی تصریح اس بارے میں ظاہر اور قطعی نہیں ہے۔ اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ حزم و یقین کے ساتھ کچھ نہ کہا جائے۔

ہوئے تخیل سے بالکل الگ ہو کر تحقیق نہ کی جائے اصلیت کا سراغ نہیں مل سکتا
سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جو حالت اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ کس
وقت کی ہے؟ اُس وقت کی ہے جب وہ نئے نئے غار میں جاکر مقیم ہوئے تھے؟
یا اس وقت کی جب انکشاف حال کے بعد دوبارہ معتکف ہو گئے۔ مفسرین نے خیال کیا
اس کا تعلق پہلے وقت سے ہے اور یہی بنیادی غلطی ہے جس نے سارا الجھاؤ
پیدا کر دیا ہے۔ دراصل اس کا تعلق بعد کے حالات سے ہے یعنی جب وہ ہمیشہ
کے لئے غار میں گوشہ نشین ہو گئے اور پھر کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے تو غار کے اندرونی
منظر کی یہ نوعیت ہو گئی تھی۔ "تحسبہم ایقاظا وھم رقود" میں "ایقاظ" سے مقصود الٰہی
کا زندہ ہونا ہے اور "رقود" سے مردہ ہونا۔ نہ کہ بیداری اور خواب۔ چنانچہ عربی میں
زندگی و موت کے لئے یہ تعبیر عام و معلوم ہے۔

پھر یہ بات سامنے لانی چاہیئے کہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا
اور جنہیں پیش آیا تھا۔ وہ عیسائی تھے صرف اتنی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ
حل ہو جاتا ہے۔

مسیحی دعوت کے ابتدائی قرنوں ہی میں زہد و انزوا کی ایک خاص زندگی شروع
ہو گئی تھی جس نے آگے چل کر رہبانیت کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ اس زندگی
کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ لوگ ترک علائق کے بعد کسی پہاڑ کی غار میں
یا کسی غیر آباد گوشہ میں معتکف ہو جاتے تھے پھر ان پر استغراق عبادت کی ایسی
حالت طاری ہو جاتی تھی کہ وضع نشست کی جو حالت اختیار کر لیتے اسی میں
پڑے رہتے، یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جاتی۔ مثلاً اگر قیام کی حالت میں مشغول ہو گئے

زیادہ بے معنی ہے اول تو کروٹ بدلنا بیداری کی دلیل نہیں۔ آدمی گہری سے گہری نیند میں ہوتا ہے اور کروٹ بدلتا ہے۔ ثانیاً اگر کروٹ بدلتے ہوں گے تو کچھ وقفے کے بعد بدلتے ہوں گے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہر آن کروٹ بدلتے ہی رہتے ہوں اور جب کبھی کوئی جھانک کر دیکھے۔ انہیں کروٹ بدلتا ہی پائے لطف یہ ہے کہ „تقلبہم ذات الیمین وذات الشمال،، کی تفسیر میں یہی مفسر ہمیں بتلاتے ہیں کہ بعضوں کے نزدیک سال میں دو دفعہ کروٹ بدلتے ہے۔ بعضوں کے نزدیک ایک مرتبہ۔ بعض کہتے ہیں تین سال بعد، بعض کہتے ہیں نو سال بعد!

علاوہ بریں قرآن نے یہ بات جس اسلوب وشکل میں بیان کی ہے اس پر ان نکتہ سنجوں نے غور نہیں کیا؛ لو اطلعت علیہم لولیت منہم فراراً ولملئت منہم رعبا یعنی غار کے اندر کا منظر اس درجہ دہشت ناک ہے کہ اگر تم جھانک کر دیکھو تو خوف کے مارے کانپ اٹھو، اور الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہو۔ اس سے معلوم ہوا۔ غار کے اندر اصحاب کہف کے اجسام نے ایسا منظر پیدا کر دیا ہے جو بیحد دہشت انگیز ہے۔ اگر کوئی آدمی باہر سے دیکھے تو دیکھنے کے ساتھ ہی اس پر دہشت چھا جائے۔ معاً الٹے پاؤں کھڑا ہو جائے اگر اندر کا منظر صرف اتنا ہی تھا کہ چند آدمی لیٹے ہوئے ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی ہیں تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے اس درجہ دہشت انگیزی ہو سکے علاوہ بریں جو آدمی باہر سے جھانکے گا وہ اتنا باریک بیں نہیں ہو سکتا کہ غار کی تاریکی میں لیٹے ہوئے آدمیوں کی آنکھیں بہ اول نظر دیکھ لے، اور وہ بھی اس حالت میں کہ داہنے یا بائیں کروٹ پر لیٹے ہوئے ہوں۔ اور پھر یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے اور جب تک مفسرین کے پیدا کئے

اس کی جرأت نہ کرتا مدتوں تک ان کی نعشیں اس حالت میں باقی رہتیں
جس حالت میں انھوں نے زندگی کے آخری لمحے بسر کئے تھے اگر موسم موافق ہوتا
اور درندوں سے حفاظت ہوتی تو صدیوں تک ڈھانچے باقی رہتے اور فاصلے
سے دیکھنے والا انہیں زندہ انسان تصور کرتا ۔ چنانچہ ویٹیکان کے تہہ خانوں میں
بے شمار ڈھانچے آج تک محفوظ ہیں جو اسی طرح کے مقامات سے برآمد ہوئے تھے
اور اپنی اصل وضع وہئیت پر باقی تھے ۔

ابتداء میں اس غرض سے زیادہ تر پہاڑوں کی غاریں یا پرانی عمارتوں کے
کھنڈر اختیار کئے گئے تھے ۔ لیکن آگے چل کر یہ طریقہ اس درجہ عام ہوگیا کہ خاص خاص
عمارتیں اس غرض سے تعمیر کی جانے لگیں یہ عمارتیں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ ان
میں آمد و رفت کے لئے کوئی دروازہ نہیں ہوتا تھا کیوں کہ جو جاتا تھا وہ پھر
باہر نہیں نکلتا تھا ۔ صرف ایک چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی رکھی جاتی تھی جو ہوا
اور روشنی کا ذریعہ ہوتی اور اسی کے ذریعے لوگ غذا بھی پہنچا دیتے ۔

بعد کو جب منا سک ازم (رہبانیت) کے باقاعدہ ادارے قائم ہوگئے تو
اس طرح کے انفرادی انزوا کی مثالیں کم ہوتی گئیں ۔ تاہم تاریخ کی شہادت موجود ہے
کہ ازمنہ وسطیٰ تک یہ طریقہ عام طور پر جاری تھا اور یورپ کی کوئی آبادی ایسی نہ تھی
جو اس طرح کی عمارتوں سے خالی ہو ۔ ان مقامات کو عام طور پر O 8 e T T کہتے تھے
اور جب ایک راہب یا راہبہ کا ان میں انتقال ہو جاتا تو ان پر یہ لاطینی لفظ کندہ
کر دیا جاتا کہ α T O ᴍ T یعنی اس کے لئے دعا کرو ۔

تاہم تاریخیں متفق ہیں کہ مسیحی رہبانیت سب سے پہلے مشرق میں شروع ہوئی

تو برابر کھڑے ہی رہتے اور اسی حالت میں جان دے دیتے اگر گھٹنے کے بل رکوع کی حالت اختیار کی تھی تو یہی حالت آخر تک قائم رہتی۔ اگر سجدے میں سر رکھ دیا تھا تو پھر سجدے ہی میں پڑے رہتے اور مرنے کے بعد بھی اسی وضع میں نظر آتے زیادہ تر گھٹنے کے بل رکوع کی وضع اختیار کی جاتی تھی کیوں کہ عیسائیوں میں تعبد و تضرع کے لئے یہی وضع رائج ہوگئی تھی [1]

غذا کی طرف سے یہ لوگ بالکل بے پرواہ ہوتے تھے اگر آبادی قریب ہوتی تو لوگ روٹی اور پانی پہنچا دیا کرتے نہیں ہوتی تو یہ جستجو نہیں کرتے عبادات کا استغراق جستجو کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے ان کی حالت ویسی ہی تھی جیسے ہندوستان کے یوگیوں کی رہ چکی ہے اور اب بھی گاہ گاہ نظر آجاتی ہے۔ جس طرح زندگی میں انہیں کوئی نہیں چھیڑتا تھا اُسی طرح مرنے کے بعد بھی کوئی

---

[1] عیسائیوں نے عبادت کی یہ وضع غالباً رومیوں سے لی۔ کیوں کہ یہودیوں کے اوضاعِ نماز میں اس وضع کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کا رکوع تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہم نماز میں کیا کرتے ہیں۔

دنیا کی مختلف قوموں نے بندگی و نیازمندی کے اظہار کے لئے مختلف وضعیں اختیار کر لی تھیں۔ رومی گھٹنا ٹیک کر جھک جاتے اور بادشاہ کے قدموں یا دامن کو بوسہ دیتے۔ مجرموں کے لئے بھی ضروری تھا کہ مجسٹریٹ کا فیصلہ گھٹنے ٹیک کر سنیں۔ مصر، بابل اور ایران میں سجدہ کی رسم پیدا ہوئی اور ہندوستان میں اوندھے مونہہ ہو کر لیٹ جانے کی۔

2 / 12002

ذکر و تعبد میں مشغول دکھائی دے گا۔ کوئی گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں ہے، کوئی سجدے میں پڑا ہے، کوئی ہاتھ جوڑے اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دہانے کے قریب ایک کُتّا ہے۔ وہ بھی بازو پھیلائے باہر کے طرف مُنہ کئے ہوئے ہے یہ منظر دیکھ کر ممکن نہیں کہ آدمی دہشت سے کانپ نہ اٹھے کیونکہ اس نے یہ سمجھ کر جھانکا تھا کہ مردوں کی قبر ہے مگر منظر جو دکھائی دیا۔ وہ زندہ انسانوں کا ہے۔

(سما) یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالو ہر بات اسطرح واضح ہو جاتی ہے گویا تمام قفلوں کو کھلنے کے لئے صرف ایک کنجی کا انتظار تھا۔ "تحسبہم ایقاظاً وھم رقود" کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ گیا کسی دور دراز کار توجیہہ کی ضرورت باقی نہیں رہی کیوں کہ اس طرح کا منظر ہی خیال پیدا کرے گا کہ لوگ زندہ ہیں۔ حالانکہ زندہ نہیں۔ "لو اطلعت علیہم لولیت فراراً ولملئت منہم رعباً" کی علت بھی سامنے آگئی اور وہ تمام بے معنی توجیہیں غیر ضروری ہوگئیں جن پر امام رازی مجبور ہوئے ہیں۔ اگر تم کسی قبر کے اندر جھانک کر دیکھو اور تمہیں مردہ نعش کی جگہ ایک آدمی نماز پڑھتا دکھائی دے تو تمہارا کیا حال ہوگا؟ یقیناً دہشت کے مارے چیخ اٹھو گے۔ اسی طرح "تقلبہم ذات الیمین وذات الشمال" کی تفسیر میں بھی کسی تکلف کی احتیاج باقی نہ رہی۔ غار شمال و جنوب رویہ واقع تھا اور ان دونوں جہتوں میں ہوا اور روشنی کے منافذ تھے۔ جیسا کہ آیت "وتری الشمس اذا طلعت" سے متبادر ہوتا ہے۔ پس بالمقابل منافذ ہونے کی وجہ سے ہوا برابر اندر چلتی رہتی تھی۔ اور ان کے ڈھانچے داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنی جانب اس طرح متحرک رہتے تھے جیسے ایک زندہ آدمی ایک طرف سے پلٹ کر دوسری طرف دیکھے۔

اور اس کا بڑا مرکز مصر اور فلسطین تھا۔ پھر چوتھی صدی مسیحی میں یہ یورپ پہنچی، اور
سینٹ۔ بینی ڈکٹ (St. Benedict) نے سب سے پہلے اس کے قواعد و ضوابط
منضبط۔ سینٹ بینی ڈکٹ نے بھی ایک پہاڑ کی غار ہی میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی،
مسیحی رہبانیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی
ابتدا اضطراری حالات سے ہوئی تھی۔ آگے چل کر اس نے ایک اختیاری عمل کی
نوعیت پیدا کر لی۔ یعنی ابتدا میں لوگوں نے مخالفوں کے ظلم و تشدّد سے مجبور
ہو کر غاروں اور جنگلوں میں گوشہ نشینی اختیار کی پھر ایسے حالات پیش آئے کہ یہ
اضطراری طریقہ زہد و تعبد کا ایک اختیاری اور مقبول طریقہ بن گیا۔

بہرحال معلوم ہوا کہ اصحابِ کہف کا معاملہ بھی تمام تر اسی نوعیت کا تھا ابتدا
میں قوم کے ظلم نے انہیں مجبور کیا تھا کہ غار میں پناہ لیں لیکن جب کچھ عرصہ تک وہاں
مقیم رہے تو زہد و عبادت کا استغراق کچھ اس طرح ان پر چھا گیا کہ پھر دنیا کی طرف لوٹنے
پر آمادہ نہ ہو سکے۔ اور گو ملک کی حالت بدل گئی تھی لیکن وہ بدستور غار ہی میں
معتکف رہے۔ یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

انتقال اس حال میں ہوا کہ جس شخص نے ذکر و عبادت کی جو وضع اختیار
کر لی تھی وہی وضع آخری لمحوں تک باقی رہی۔ ان کے وفادار کتّے نے بھی آخر تک
ان کا ساتھ دیا۔ وہ پاسبانی کے لئے دہانے کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ جب اس کے
مالک مر گئے تو اس نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیا۔

اب اس واقعہ کے بعد غار کے اندرونی منظر نے ایک عجیب دہشت انگیز
نوعیت پیدا کر لی۔ اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھے تو اسے راہبوں کا ایک پورا مجمع

بہتر جانتا ہے کہ فی الحقیقت کتنی مدت گزر چکی ہے پس یہ قرآن کی تصریح نہیں ہے لوگوں کا قول ہے اور سیقولون" سے نقل اقوال کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اسی سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی ایسی ہی تفسیر مروی ہے۔

(ل) امام قرطبی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ" او لائک قوم فنوا وعلموا مدة طویلة" یعنی اصحاب کہف کی موت پر ایک مدت گذر چکی ہے ان کے اجسام فنا ہو گئے جس طرح ہر جسم فنا ہو جاتا ہے۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام کے غزوات میں بعض صحابہ کا گذر ہوا اصحاب کہف کی غار پر ہوا تھا اور انہیں ان کی ہڈیاں ملی تھیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس سے اس کی بھی مزید تصدیق ہو گئی کہ یہ واقعہ پیٹرا میں پیش آیا تھا۔ مسیحی رہبانیت کے طریقہ کی نسبت مندرجہ صدر بیانات میں جو ارشادات کئے گئے ہیں ان کی تفصیلات کے لئے حسب ذیل کتابیں دیکھنی چاہئیں۔

The Paradise or garden of The holy Fathers by E. A. W. Budge.

The Evolution of The manastion deal by H. workman.

Five Centureis of Religion by G. G Coulton

The Medievel mind by H. O. Taylor.

اس تفسیر کے بعد اس سوال کا جواب بھی خود بخود مل گیا کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات کیوں بیان کی کہ سورج کی کرنیں غار کے اندر نہیں پہنچتیں جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت ۱۷ میں ہے اور کیوں اسے قدرتِ الہٰی کی ایک نشانی فرمایا کہ "ذالک من ایات اللہ" معلوم ہو گیا کہ یہ دراصل اس بات کی تمہید تھی جو بعد کو آیت ۱۸ میں بیان کی گئی ہے کہ "تحسبہم ایقاظاً وھم رقود" یعنی چونکہ یہ بات بیان کرنی تھی کہ مرنے کے بعد ان کی نعشیں عرصہ تک باقی رہیں حتٰی کہ دیکھنے والوں کو زندہ انسانوں کا گمان ہوتا تھا اس لئے پہلے اس کی علت واضح کر دی کہ وہ غار میں معتکف ہوئے تھے وہ اس طرح کا غار تھی کہ انسانی جسم زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اس میں قائم رہ سکتا تھا۔ کیونکہ سورج کی روشنی اس میں پہنچتی رہتی۔ لیکن سورج کی تپش کا اس میں گذر نہ تھا۔ جو چیز نعش کو جلد گلا سڑا دیتی ہے وہ سورج کی تپش ہے۔ اور جو چیز تازگی پیدا کرتی ہے وہ روشنی اور ہوا ہے۔ ہوا چلتی رہتی مگر تپش سے پوری حفاظت تھی وذالک من آیات اللہ۔

(ح) "ولبثوا فی کہفہم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعا" (۲۵) کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ خود قرآن کی تصریح ہے کہ وہ لوگ اتنی مدت تک غار میں پڑے رہے؟ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر اس کے بعد کیوں فرمایا کہ قل اللہ اعلم بما لبثوا؟ مفسرین کو اس اشکال کے دور کرنے میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے۔ حالانکہ صاف مطلب وہی ہے جو حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یعنی جس طرح پہلے ان کی تعداد کے بارے میں لوگوں کے مختلف قول نقل کیا ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں غار میں تین سو برس تک رہے۔ بعضوں نے اس پر نو سو برس اور بڑھا دیئے۔ تم کہہ دو اللہ ہی

ذوالقرنین

خامساً: وہ ایک عادل حکمراں تھا۔ جب وہ مغرب کی طرف فتح کرتا ہوا دور تک چلا گیا تو ایک قوم ملی، جس نے خیال کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح ذوالقرنین بھی ظلم و تشدد کرے گا۔ لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بے گناہوں کے لئے کوئی اندیشہ نہیں ہے، جو لوگ نیک عملی کی راہ چلیں گے ان کے لئے ویسا ہی اجر بھی ہوگا۔ البتہ ڈرنا انہیں چاہیئے جو جُرم و بدعملی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

سادساً: وہ خدا پرست اور راست باز انسان تھا اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔

سابعاً: وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حریص نہ تھا۔ جب ایک قوم نے کہا یاجوج اور ماجوج ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک سد تعمیر کر دیں۔ ہم خراج دیں گے تو اس نے کہا، "ما مکنی فیہ ربی خیر" جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہی میرے لئے بہتر ہے۔ میں تمہارے خراج کا طامع نہیں۔ یعنی میں خراج کی طمع سے یہ کام نہیں کروں گا۔ اپنا فرض سمجھ کر انجام دوں گا۔

تاریخ قدیم کی جس شخصیت میں یہ تمام اوصاف و اعمال پائے جائیں وہی ذوالقرنین ہو سکتا ہے سوال یہ ہے کہ یہ کون شخص تھا؟

سب سے پہلا حل طلب مسئلہ جو مفسرین کے سامنے آیا وہ اس لقب کا تھا۔ عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی "قرن" کے صاف معنی سینگ کے ہیں پس ذوالقرنین کا مطلب ہوا دو سینگوں والا۔ لیکن چونکہ تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملا جس کا ایسا لقب رہا ہو۔ اس لئے مجبوراً "قرن" کے معنی میں طرح طرح کے

سورۂ کہف میں تیسرا واقعہ جو بیان کیا گیا ہے۔ وہ ذوالقرنین کا ہے۔ کیونکہ لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تھا۔ تمام مفسرین متفق ہیں کہ سوال یہودیوں کی جانب سے تھا۔ اگرچہ غالباً مشرکین مکہ کی زبانی ہوا کیونکہ سورت مکی ہے۔

قرآن نے ذوالقرنین کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو حسب ذیل امور سامنے آجاتے ہیں۔

اولاً جس شخصیت کی نسبت پوچھا گیا ہے وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا۔ یعنی ذوالقرنین کا لقب خود قرآن نے تجویز نہیں کیا ہے پوچھنے والوں کا تجویزہ ہے کیونکہ فرمایا "یسئلونک عن ذی القرنین"

ثانیاً: اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اسے حکمرانی عطا فرمائی تھی اور ہر طرح کا ساز و سامان جو ایک حکمران کیلئے ہو سکتا ہے اُس کے لئے فراہم ہو گیا تھا۔

ثالثاً اس کی بڑی مہمیں تین تھیں پہلے مغربی ممالک فتح کئے۔ پھر مشرقی پھر ایک ایسے مقام تک فتح کرتا ہوا چلا گیا۔ جہاں پہاڑی درہ تھا اور اس کی دوسری طرف سے یاجوج اور ماجوج آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔

رابعاً: اس نے وہاں ایک محکم سد تعمیر کر دی اور یاجوج و ماجوج کی راہ بند ہو گئی۔

دانیال نبی کا خواب

اگر ذوالقرنین کے مفہوم کا کوئی سراغ ملتا تھا تو وہ صرف ایک دور کا اشارہ تھا جو حضرت دانیال کی کتاب میں ملتا ہے۔ یعنی خواب میں جو انہوں نے بابل کی اسیری کے زمانہ میں دیکھا تھا۔

بابل کی اسیری کا زمانہ یہودیوں کے لئے نہایت مایوسی کا زمانہ تھا۔ ان کی قومیت پامال ہو چکی تھی۔ ان کا ہیکل منہدم ہو چکا تھا۔ ان کے شہر اجاڑ تھے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی ہلاکت کے بعد ان کی زندگی کا کیا سامان ہو سکتا ہے۔ اسی زمانہ میں حضرت دانیال کا ظہور ہوا، جو اپنے علم و حکمت کی وجہ سے شاہانِ بابل کے دربار میں نہایت مقرب ہو گئے تھے۔ انہیں کی نسبت تورات

تکلفات کرنے پڑے پھر چونکہ فتوحات کی وسعت اور مغرب و مشرق کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندر مقدونی کی شخصیت سب سے زیادہ مشہور رہی ہے اس لئے متاخرین کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ چنانچہ امام رازی نے سکندر ہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے اور اگرچہ حسبِ عادت وہ تمام اعتراضات نقل کر دیتے ہیں جو اس تفسیر پر وارد ہوتے ہیں لیکن پھر حسبِ عادت ان کے بے محل جوابات پر مطمئن بھی ہو گئے ہیں حالانکہ کسی اعتبار سے بھی قرآن کا ذوالقرنین سکندر مقدونی نہیں ہو سکتا۔ نہ تو وہ خدا پرست تھا۔ نہ عادل تھا۔ نہ مفتوح قوموں کے لئے فیاض تھا اور نہ ہی اس نے کوئی سد بنائی۔

بہرحال مفسرین ذوالقرنین کی شخصیت کا سراغ نہ لگا سکے۔

٠ ٭ ٭ ٭ ٠

سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اور چونکہ یہ دونوں مملکتیں مل کر ایک شہنشاہی بننے
والی تھیں۔ اس لئے شہنشاہ مادہ و فارس کو دو سینگوں والے مینڈھے کی
شکل میں ظاہر کیا گیا پھر اس مینڈھے کو جس نے شکست دی وہ یونان کے
بکرے کا پہلا سینگ تھا یعنی سکندر مقدونی تھا جس نے فارس پر حملہ کیا اور
کیانی شہنشاہی کا خاتمہ ہو گیا

اس خواب میں بنی اسرائیل کے لئے بشارت یہ تھی کہ ان کی آزادی و
خوش حالی کا نیا دور انہی دو سینگوں والی شہنشاہی کے ظہور سے وابستہ تھا
یعنی شہنشاہ فارس بابل پر حملہ کر کے فتح مند ہونے والا تھا۔ اور پھر اس کے
ذریعے بیت المقدس کی از سر نو تعمیر اور یہودی قومیت کی دوبارہ شیرازہ بندی
ہونے والی تھی۔ چنانچہ برسوں کے بعد سائرس کا ظہور ہوا اس نے میڈیا اور پارس
کی مملکتوں کو ملا کر ایک عظیم الشان شہنشاہی قائم کر دی اور پھر بابل پر پے در پے
حملے کر کے اسے مسخر کر لیا۔

چونکہ اس خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ
دی گئی تھی اس لئے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لئے یہودیوں
میں ذو القرنین کا تصور پیدا کر دیا گیا ہو یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی اور
وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں تاہم یہ محض ایک قیاس تھا۔ اس کی تائید
میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی۔

لیکن ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے جس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد
منظر عام پر آئے۔ اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا اور [illegible]

میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ "بیلشضر" شاہ بابل کی سلطنت کے تیسرے برس انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا اور اس خواب میں انہیں آنے والے واقعات کی بشارت دی گئی تھی۔

چنانچہ کتاب دانیال میں ہے۔

"میں کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے کنارے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ دونوں سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے تھا میں نے دیکھا کہ پچھم اتر اور دکن کی طرف وہ سینگ مارتا ہے یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا اور وہ بہت بڑا ہو گیا۔ میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا پچھم کی طرف سے ایک بکرا آکے روئے زمین پر پھر گیا۔ اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب طرح کا سینگ تھا۔ وہ دو سینگ والے مینڈھے کے پاس آیا اور اس پر غضب سے بھڑکا، اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے!!

پھر اس کے بعد ہے کہ جبریل نمایاں ہوا اور اس نے اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ دونوں سینگوں والا مینڈھا مادہ اور فارس کی بادشاہت ہے اور بال والا بکرا یونان کی۔ جو بڑا سینگ اس کی آنکھوں کے درمیان دکھائی دیا ہے وہ اس کا پہلا بادشاہ ہوگا۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مادہ (میڈیا) اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں

پارس انبیاء بنی اسرائیل سے عقیدت رکھتے تھے اور اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ اسی خواب سے "ذو القرنین" کا تصور پیدا ہو گیا ہو۔ [illegible] کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ سائرس ہی "ذو القرنین" سمجھا جاتا [illegible] اور لوگ عربی، یہودی بھی اسے اسی لقب سے پکارا کرتے تھے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لیے جب [illegible] پر نظر ڈالی جاتی ہے جو یونانی اور فارسی کی زبانی ہم تک پہنچی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن

بقیہ حاشیہ صفحہ [illegible] اختیار کر لی ہے اور [illegible] سے [illegible] غلطیاں کی ہیں۔ سائرس کا اصلی نام [illegible] [illegible] سے معلوم ہوتا ہے لیکن یونانی اسے سائرس کہنے لگے اور یہودیوں نے اس کا تلفظ خورس کی شکل میں کیا۔ چنانچہ یسعیاہ، یرمیاہ اور دانیال کے صحائف میں جا بجا یہ نام آیا ہے اور یہی گورش [illegible] عربی میں خسرو کی شکل اختیار کر لی چنانچہ عرب اسے کیخسرو کے نام سے پکارتے۔

سائرس کا لڑکا کیمبی سیز ہوا۔ یہ بھی یونانی تلفظ ہے۔ فارسی نام کمبوجیہ تھا۔ جس نے یہودیوں اور عربوں کی زبان پر کیقباد کی شکل اختیار کر لی شاہنامہ نے بھی اسی کو اختیار کیا کیونکہ اس کی بنیاد عربی تراجم پر تھی۔ کیقباد کے بعد دارا پیدا ہوا۔ جسے عام طور پر دارا کے نام سے پکارا جاتا ہے اور تورات میں بھی یہی نام آیا ہے۔ دارا کے بعد ارتازرکسیز ہے اسے تورات میں ارتخششت کے نام سے یاد کیا ہے اور عربوں میں اردشیر مشہور ہو گیا۔

در فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا۔ اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا بلکہ خود سائرس کا یا باشندگان فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا۔

اس انکشاف نے شک وتخمین کے تمام پردے اٹھا دیئے یہ خود سائرس کا ایک سنگی تمثال ہے جو اصطخر کے کھنڈروں میں دستیاب ہوا اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں اور پر خط منحنی میں جو کتبہ کندہ تھا۔ اس کا بڑا حصہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکا ہے مگر جس قدر باقی ہے وہ اس کے لئے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جاتی اس سے معلوم ہو گیا کہ دانیال۔۔۔ فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخیل ایک مقبول اور عام تخیل تھا اور یقیناً سائرس کو "ذوالقرنین" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ تمثال میں پروں کا ہونا اس کے ملکوتی صفات وفضائل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ صرف پارسیوں میں بلکہ تمام معاصر قوموں میں یہ اعتقاد عام طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے۔

دو سینگوں کا تخیل ابتداء میں کیونکر پیدا ہوا؟ کیا اس کی بنیاد دانیال نبی کا خواب تھا یا بطور خود سائرس نے یا باشندگان پارس نے یہ تخیل پیدا کیا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن اگر تورات کی روایات تسلیم کر لی جائیں۔ تو سائرس سے لے کر اردشیر ششم (ارتحششت) اول تک، تمام شہنشاہان پارس لوبیا [illegible] چاہیئے کہ شاہان فارس کے ناموں نے مختلف زبانوں میں مختلف صورتیں۔۔۔

مؤرخین کی شہادت ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔

حضرت مسیح سے پانچ سو ساٹھ برس پہلے ایران کی سرزمین دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا اور شمالی مغربی میڈیا[1] چونکہ ان کے ہمسایہ میں آشوری اور بابلی حکومتیں انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھیں۔ اس لئے قدرتی طور پر یہ ان سے دبی ہوئی تھیں۔ دونوں مملکتوں میں مختلف قبائل کے امراء تھے جو اپنے اپنے حلقوں میں قبائلی حکومت رکھتے تھے۔

۶۱۲ قبل مسیح میں جب نینوا تباہ ہوگیا اور آشوری فرماں روائی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی تو میڈیا کے باشندے آزاد ہوگئے اور بتدریج ایک قومی حکومت نشوونما پانے لگی۔ اسی طرح پارس کے امراء قبائل میں سے بھی بعض امیروں کو سر اٹھانے کا موقع ملا اور حکمران خاندان پیدا ہوگیا۔ تاہم یہ دونوں مملکتیں وقت کی بے اثر حکومتیں تھیں اور بابل کی شہنشاہی جسے بخت نصر کی تہارانہ فتحمندیوں نے تمام ایشیا میں سربلند کر دیا تھا سب پر چھائی ہوئی اور سب کو مقہور کئے ہوئے تھی۔

---

[1] دارا کے کتبہ بے ستون میں اس کا نام ماد آیا ہے۔ اس لئے میڈیا یونانی تلفظ سمجھنا چاہیئے۔ عرب مورخوں نے اسے ماہات سے تعبیر کیا ہے۔

کے بیان کی ہو بہو تصویر ہے اور دونوں بیان اس درجہ باہم مطابقت رکھتے ہیں کہ ممکن نہیں کسی دوسری شخصیت کا وہم وگمان بھی کیا جا سکے۔

زمانہ حال کے محققین تاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین عہدوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا عہد حملہ اسکندریہ سے پہلے کا ہے۔ دوسرا پارتھوی یا ملوک الطوائف کا۔ تیسرا ساسانی سلاطین کا۔ فارسی شہنشاہی کی عظمت کا اصلی عہد وہی ہے جو حملہ اسکندریہ سے پہلے گزرا اور جس کی تاریخ سائرس کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اس عہد کے حالات معلوم کرنے کے لئے براہ راست ذرائع مفقود ہو گئے ہیں۔ جس قدر بھی حالات روشنی میں آئے ہیں، تمام تر یونانی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ ان میں زیادہ معتمد تین مورخ ہیں ہیروڈوٹس (Harodotus) ڈسیاز (Ctesies) اور زینوفن (Xenaphon)

فتح ایران کے بعد جب عرب مورخین نے ایران کی تاریخ مرتب کرنی چاہی تو انہیں جس قدر مواد ہاتھ آیا وہ تمام تر پارسیوں کی قومی روایات پر مشتمل تھا۔ ان روایات میں حملہ اسکندر سے پہلے کا زمانہ اسی طرح کے قومی افسانوں کی نوعیت رکھتا ہے جس طرح ہندوستان میں پرانوں کے افسانے یا مہابھارت اور راماین کے قصے ہیں۔ البتہ پچھلے دو عہدوں کی روایتیں تاریخی بنیادوں پر تھیں جب دقیقی اور فردوسی نے شاہنامہ کو نظم کرنا چاہا تو انہیں عربی میں یہی مواد ملا اور اسی کو انھوں نے نظم کا جامہ پہنا دیا۔ بس یہ تمام ذخیرہ قبل از سکندر عہد کے لئے کچھ سودمند نہیں ہے اور سائرس کے حالات کے لئے ہمیں تمام تر یونانی

عبرانیوں نے خورس اور عربوں نے کیخسرو کے نام سے پکارا۔ اسے پہلے پارس کے تمام امیروں نے اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا۔ پھر بغیر کسی خونریزی کے میڈیا کی مملکت پر فرماں روا ہوگیا اور اس طرح دونوں مملکتوں نے مل کر ایران کی ایک عظیم الشان شہنشاہی کی صورت اختیار کرلی۔

پھر اُس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ فتوحات نہیں جو ظلم و قہر کی خونریزیوں کے ذریعے حاصل کی جاتی تھیں بلکہ انسانیت و عدالت کی فتوحات جو تمام تر اسلئے تھیں کہ مظلوم قوموں کی دادرسی اور پامال ملکوں کی دستگیری ہو۔ چنانچہ ابھی بارہ سال کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ بحر اسود سے لے کر بکٹریا (بلخ) تک ایشیاء کی تمام عظیم الشان مملکتیں اس کے آگے سربسجود ہوچکی تھیں۔

دنیا کی تمام غیر معمولی شخصیتوں کی طرح سائرس کے ابتدائی حالات نے بھی ایک پر اسرار افسانہ کی نوعیت اختیار کر لی ہے اور یہیں اُس کی جھلک شاہنامہ کے افسانوں میں صاف صاف نظر آجاتی ہے۔ اُس کا اٹھان زندگی کے عام اور معمولی حالات میں نہیں ہوا بلکہ ایسے عجیب حالات میں جو ہمیشہ پیش نہیں آتے اور جب کبھی پیش آتے ہیں تو یہ قدرت کی ایک غیر معمولی کرشمہ سنجی ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ پیدا ہو اس کے نانا اسٹیاگس نے اس کی موت کا سامان کر دیا تھا لیکن وہ ایک حیرت انگیز طریقے پر بچا لیا جاتا ہے اور اس کی ابتدائی زندگی جنگلوں اور پہاڑوں میں بسر ہوتی ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ اس کی غیر معمولی قابلیتیں اور اعلیٰ اخلاق و خصائل اسے ملک میں نمایاں کرتے ہیں اور اس کی خاندانی شخصیت پہچان لی جاتی ہے۔ اب اسے پورا موقع حاصل تھا کہ اپنے دشمنوں

سائرس کا ظہور

لیکن ۵۵۹ قبل از مسیح میں ایک غیر معمولی شخصیت، غیر معمولی حالات کے اندر ابھری اور اچانک تمام دنیا کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ یہ پارس کے ایکھے می نیز سلہ[1] خاندان کا ایک نوجوان کورش تھا جسے یونانیوں نے سائرس

---

[1] دارا نے بے ستون کے کتبہ میں اپنا سلسلہ نسب ہخامنش نامی بادشاہ سے ملایا ہے۔ یہی ہخامنش یونانی میں (Achaemenes) رہ گیا۔ ہیروڈوٹس کی روایت کے مطابق یہ سائرس کا پردادا تھا یعنی ایکھے می نیز سے ٹیز پیز (چائش پش) پیدا ہوا۔ اس سے کم بی سیز (کمبوجیہ یا کیقباد) اوّل اور کم بی سیز سے سائرس۔ سائرس نے اپنے بڑے لڑکے کا نام بھی کم بی سیز رکھا تھا۔

بیل شازار[۵] کے مظالم سے انہیں نجات دلائے

نینوا کی تباہی نے ایک نئی بابلی شہنشاہی کی بنیادیں استوار کر دی تھیں، اور بنوکدرزار (بخت نصر) کی قاہرانہ فتوحات نے تمام مغربی ایشیاء کو مسخر کر لیا تھا۔ اس کا حملہ بیت المقدس تاریخ کا ایک انقلاب انگیز واقعہ ہے وہ صرف بادشاہوں کو مسخر ہی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ قوموں کو غلام بناتا اور ملکوں تباہ کر ڈالتا تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اس کی جنگ جویانہ کی جانشیں ہوتی۔ اس کے بعد بابل کے مندروں کے پجاریوں نے (جو ملک میں سب سے زیادہ اثر و مقبولیت رکھتے تھے) نابونی دس کو تخت نشین کیا تھا۔ لیکن اس نے حکومت کا تمام کاروبار بیل شازار کے ہاتھ چھوڑ دیا جو ظلم و عیاشی کا مجسمہ تھا۔

---

[۵] دانیال نبی کی کتاب میں اسے جا بجا "بیلشازار" کے نام سے پکارا گیا ہے لیکن بابل کے کتبوں سے اس کا صحیح نام جو معلوم ہوا ہے یہی ہے علاوہ بریں معلوم ہوتا ہے کہ نوشتہ کے لکھنے والوں نے سائرس اور دارا کے دو مختلف حملوں کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا ہے اور کہیں سائرس کی جگہ دارا کا نام آ گیا ہے کہیں دارا کی جگہ سائرس کا۔ تاریخی حیثیت سے جو واقعہ رونما ہوا ہے وہ یہ ہے کہ بابل پر فارس کے دو حملے ہوئے ہیں۔ پہلا سائرس نے کیا۔ دوسرا دارا نے سائرس نے بابل فتح کر کے اس کی اندرونی حکومت وطنی امراء کے ہاتھ چھوڑ دی تھی پھر تقریباً بیس برس بعد امراء بابل نے بغاوت کی اور دارا مجبور ہوا کہ دوبارہ بابل کو فتح کرے۔

سے انتقام لے لیکن اسے ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا خیال نہیں گزرتا حتی کہ خود اسٹاکس کی زندگی بھی اس کے ہاتھوں محفوظ رہتی ہے۔

تخت نشینی کے بعد سب سے پہلی جنگ جو اسے پیش آئی وہ لیڈیا کے بادشاہ کروئیسس سے تھی۔ لیکن تمام مورخین متفق ہیں کہ حملہ کروئیسس کی طرف سے ہوا تھا اور اس نے سائرس کو دفاع پر مجبور کر دیا تھا۔ لیڈیا سے مقصود ایشیائے کوچک کا مغربی و شمالی حصہ ہے۔ جو یونانی تمدن کا ایشیائی مرکز بن گیا تھا اور اس کی حکومت بھی اپنے تمام خصائص میں ایک یونانی حکومت تھی جنگ میں سائرس فتح یاب ہوا لیکن رعایا کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی انہیں محسوس بھی نہیں ہوا کہ ملک ایک انقلاب جنگ کی حالت سے گذر رہا ہے۔ البتہ کروئیسس کی نسبت یونانی روایت یہ ہے کہ اس کے عزم و ہمت کی آزمائش کے لئے سائرس نے حکم دیا تھا، چتا تیار کی جائے اور اسے جلا دیا جائے لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ مردانہ وار چتا پر بیٹھ گیا ہے تو فوراً اس کی جان بخشی کر دی گئی اور اس نے بقیہ زندگی عزت و احترام کے ساتھ بسر کی۔

اس جنگ کے بعد اسے مشرق کی طرف متوجہ ہونا پڑا کیونکہ گیڈروسیا (مکران) اور بکٹریا (بلخ) کے وحشی قبائل نے سرکشی کی تھی۔ یہ مہم ۵۴۰ اور ۵۴۵ قبل مسیح کی درمیانی مدت میں واقع ہوئی ہوگی۔

تقریباً یہی زمانہ ہے جب باشندگان بابل نے اس سے درخواست کی کہ

(یعنی قدیم برباد شدہ ہیکل سلیمانؑ کو از سر نو تعمیر کروں) پس تمام لوگوں کو ہر طرح کا ساز و سامان اس کے لئے مہیا کرنا چاہیئے" اس نے سونے چاندی کے وہ تمام ظروف جو نبوکدرزار ہیکل سے لوٹ کر لایا تھا، بابل کے خزانے سے نکلوائے اور یہودیوں کے ایک امیر شیشبضر کے حوالے کر دیئے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد اس میں بدستور رکھ دیئے جائیں۔

بابل کی فتح کے بعد سائرس کی عظمت تمام مغربی ایشیاء میں مسلم ہو گئی ۵۳۶ ق م میں صرف اسی کی تنہا شخصیت عظمت و حکمرانی کے عالمگیر تخت پر نمایاں نظر آتی ہے۔ بارہ برس پہلے وہ پارس کے پہاڑوں کا ایک گمنام انسان تھا لیکن اب ان تمام مملکتوں کا تنہا فرمانروا ہے جو صدیوں تک قوموں کی ابتدائی عظمتوں اور فتح مندیوں کا مرکز رہ چکی ہیں فتح بابل کے بعد وہ تقریباً دس برس تک زندہ رہا اور ۵۲۹ قبل مسیح میں انتقال کر گیا۔

اب قبل اس کے کہ قرآن کے بیان کردہ حالات پر نظر ڈالی جائے اس بات پر غور کر لینا چاہیئے کہ انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں اس شخصیت کے بارے میں کیا تھیں، اور یہودیوں کے اعتقاد میں کس طرح بہ حرف بحرف پوری ہوئیں؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلی پیشین گوئی یسعیاہ نبی کی ہے جن کا ظہور سائرس کی فتح بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے ہوا تھا انہوں نے پہلے بیت المقدس کی تباہی کی خبر دی ہے کہ بابل کے ہاتھوں ظہور میں آئے گی۔ اس کے بعد اس کی دوبارہ تعمیر کی بشارت دی ہے اور اس سلسلہ میں خورس

اسی کی نسبت دانیال نبی کے صحیفہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ بیت المقدس کے ہیکل کے مقدس پیالوں میں اس نے شراب پی تھی اور ایک غیبی ہاتھ نمایاں ہو کر " منے منے تقیتل ا فرسین " کے الفاظ دیوار پر لکھ دیتے تھے۔

تمام مورخین متفق ہیں کہ اس عہد میں بابل سے زیادہ مستحکم اور ناقابل فتح کوئی شے نہ تھی۔ اس کی چار دیواری اتنی موٹی تہہ در تہہ اور اونچی تھی کہ اسے مسخر کرنے کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بایں ہمہ سائرس نے باشندگان بابل کی فریاد پر لبیک کہا اور دوآبہ کا تمام علاقہ فتح کرتا ہوا شہر کے سامنے نمودار ہو گیا۔ چونکہ باشندگان شہر بیل شازار کے مظالم سے تنگ آ گئے تھے اور سائرس کے لئے چشم براہ تھے اس لئے انہوں نے ہر طرح اس کا ساتھ دیا۔ خود بابلی حکومت کا ایک سابق گورنر گوبریاس اس کی فوج کے ساتھ تھا۔ ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ اس شخص نے دریا سے نہریں کاٹ کر اس کا بہاؤ دوسری طرف ڈال دیا اور دریا کی جانب سے فوج شہر میں داخل ہو گئی قبل اس کے کہ خود سائرس شہر میں پہنچے شہر فتح ہو چکا تھا۔

تورات کی شہادت یہ ہے کہ سائرس کا ظہور اور بابل کی فتح بنی اسرائیل کے لئے زندگی و خوشحالی کا نیا پیام تھا اور یہ ٹھیک اسی طرح ظہور میں آئی جس طرح یسعیاہ نبی نے ایک سو ساٹھ برس پہلے اور یرمیاہ نے ساٹھ برس پہلے وحی الٰہی سے مطلع ہو کر خبر دے دی تھی۔ چنانچہ سائرس نے دانیال نبی کی نہایت توقیر کی۔ یہودیوں کو یروشلم میں بسنے کی اجازت دے دی نیز اپنی تمام مملکت میں اعلان کیا کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یروشلم میں اس کے لئے ایک ہیکل بناؤں۔

لے لیا گیا۔ بعل رسوا ہوا۔ مردوک سراسیمہ کیا گیا اس کے بت خجل ہوئے۔ اس کی سورتیں پریشان کی گئیں کیونکہ اتر سے ایک قوم ان پر چڑھتی ہوئی آرہی ہے جو اس کی سرزمین اجاڑ دے گی۔ یہاں تک کہ اس میں کوئی نہیں رہے گا۔" (۵۰:۱)

یرمیاہ نبی نے اس کی بھی پیشین گوئی کردی تھی کہ ستر (۷۰) برس تک یہودی بابل میں قید رہیں گے اور اس کے بعد بیت المقدس کی نئی تعمیر ہوگی۔

"خداوند کہتا ہے: جب بابل پر ستر (۷۰) برس گذر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا تب تم مجھے پکاروگے اور میں جواب دوں گا تم مجھے ڈھونڈوگے اور مجھے پالوگے ـــ میں تمہاری اسیری ختم کردوں گا۔ تمہیں تمہارے مکانوں میں واپس لے آؤں گا۔" (۲۹:۱۰)

اس پیشین گوئی میں خدا نے اپنی رحمت کی واپسی کو فتح بابل کے واقعہ سے وابستہ کردیا ہے۔ گویا سائرس کا ظہور اس کی رحمت کا ظہور ہوگا جو بنی اسرائیل پر پھر لوٹ آئے گی۔

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب سائرس نے بابل فتح کیا تو دانیال نبی نے (جو شاہان بابل کے وزراء میں داخل ہوگئے تھے) اسے یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی دکھلائی کہ ایک سو ساٹھ برس پہلے اس کے ظہور کی خبر دے دی گئی تھی۔ یہ بات دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اسی کا نتیجہ وہ فرمان تھا۔ جو اس نے تعمیر ہیکل کے لئے جاری کیا۔

نقادانِ حال کے نقاد ان پیشین گوئیوں کی اصلیت پر مطمئن نہیں ہیں۔۔۔

(سائرس کے ظہور کا ذکر کیا ہے۔

" خداوند تیرا نجات دینے والا یوں فرماتا ہے کہ یروشلم پھر آباد کیا جائے گا۔ یہوداہ کے شہر بنائے جائیں گے میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا ـــــ میں خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور میری ساری مرضی پوری کرے گا۔ خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اُس کا داہنا ہاتھ پکڑا۔ تاکہ قوموں کو اُس کے قابو میں کر دوں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا دوں اور دہرے دروازے اس کے لئے کھول دوں ہاں میں تیرے آگے چلوں گا۔ میں ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کر دوں گا میں پیتل کے دروازوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ میں گڑے ہوئے خزانے اور چھپے ہوئے مکانوں کے گنج تجھے عطا کروں گا اور یہ سب کچھ اس لئے کروں گا تاکہ تو جان لے کہ خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے اپنی برگزیدہ قوم اسرائیل کے لئے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا ہے"

(یسعیاہ ۲۱ : ۲۴)۔

اس پیشین گوئی میں خدا کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ خورس (سائرس) میرا چرواہا ہو گا اور میں نے اسے اس لئے پکارا ہے کہ بنی اسرائیل کو بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے۔ نیز اُسے " خدا کا مسیح" بھی کہا ہے۔

اس طرح یرمیاہ نبی نے ساٹھ برس پہلے پیشین گوئی کی تھی

" قوموں کے درمیان منادی کرو اور اسے مت چھپاؤ کہو، بابل

قرآن کی تصریحات اور سائرس

اب غور کرو قرآن کی تصریحات سے جو جامہ تیار کیا ہے، وہ کس طرح ٹھیک ٹھیک صرف سائرس ہی کے جسم پر راست آتا ہے؟ ہم نے اس بحث کے آغاز میں تصریحات قرآنی کا خلاصہ دے دیا ہے جو سات دفعات پر مشتمل ہے۔ ان پر پھر ایک نظر ڈال لو۔

(۱) سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ ذوالقرنین کی نسبت سوال بالاتفاق یہودیوں کی جانب سے ہوا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر یہودی بادشاہ کی شخصیت یہودیوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاسکتی تھی تو صرف سائرس ہی کی تھی۔ نبیوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق تھا، دانیال نبی کے خواب کا ظہور، رحمتِ الٰہی کی واپسی کی بشارت، بنی اسرائیل کا نجات دہندہ، خدا کا فرستادہ چرواہا اور پھر یروشلم کی تعمیر ثانی کا وسیلہ! پس اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ اسی کی نسبت ان کا سوال ہو؟

سدی کی ایک روایت میں بھی جو قرطبی وغیرہ نے نقل کی ہے اس طرف صریح اشارہ ملتا ہے: قال: قالت الیهود: اخبرنا عن نبی لم یذکره الله

کہتے ہیں: ہو سکتا ہے کہ یہ پیشین گوئیاں واقعات کے ظہور کے بعد بڑھا دی گئی ہوں۔
خصوصاً یسعیاہ کی پیشین گوئی جس میں صریح خورس (سائرس) کا نام موجود ہے
لیکن وہ اس اشتباہ کی تائید میں عقلی استغراب کے سوا اور کوئی دلیل پیش نہیں
کرسکتے اور محض عقلی استغراب ان صحائف کے خلاف حجت نہیں ہو سکتا۔
جن کی نسبت یقین کیا گیا کہ الہام سے لکھے گئے۔ پھر علاوہ بریں تورات کے
آخری صحائف جو فتح بیت المقدس کے اثنا میں یا اسیری بابل کے زمانے میں لکھے
گئے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے محفوظ تسلیم کر لیے گئے ہیں کیونکہ وہ اس وقت سے
برابر یہودیوں میں متداول رہے۔ اور کوئی حادثہ ایسا پیش نہیں ہوا کہ ان کے
نسخے نابود کر دیے گئے ہوں۔ ممکن ہے کہ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں بھی دانیال نبی کے
خواب کی طرح خورس کا نام نہ بتلایا گیا صرف قوم و ملک کا ذکر ہو اور بعد کو یہ نام
بڑھا دیا گیا ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہودیوں کا تمام اعتقاد برابر یہی رہا کہ
سائرس کا ظہور نبیوں کی پیشین گوئی کے مطابق ہوا اور وہ خدا کی ایک برگزیدہ
ہستی تھی جو اس لیے پیدا کی گئی تھی کہ مظلوموں کی دادرسی ہو اور بابلیوں کے ظلم و
شرارت سے قوموں کو نجات ملے۔

آوئی ہو پس ضروری ہے کہ ذوالقرنین کو بھی حکمرانی کا مقام ایسے ہی حالات میں ہو جو بالکل غیر معمولی قسم کے ہوں اور انہیں محض توفیق الٰہی کی کرشمہ سازی سمجھا جاسکے۔ کیونکہ اس کے تمکن فی الارض کو براہ راست خدا کی طرف نسبت دی ہے۔

لیکن اس اعتبار سے سائرس کی زندگی ٹھیک ٹھیک اس آیت کی تفسیر ہے اس کی ابتدائی زندگی ایسے حالات میں بسر ہوئی جنہیں حیرت انگیز حوادث نے ایک افسانہ کی شکل دے دی۔ قبل اس کے پیدا ہو خود اس کا نانا اس کی موت کا خواہش مند ہو گیا تھا۔ ایک وفادار آدمی اس کی زندگی بچا تا ہے اور وہ شاہی خاندان سے بالکل الگ ہو کر ایک گمنام گڈریئے کی طرح پہاڑوں میں زندگی بسر کرتا ہے پھر اچانک نمایاں ہوتا ہے اور بغیر کسی جنگ و مقابلہ کے میڈیا کا تخت اس کے لئے خالی ہو جاتا ہے! یقیناً یہ صورتِ حال واقعات و حوادث کی عام رفتار نہیں ہے جو ہمیشہ پیش آتی ہو نو اور ہستی کی ایک غیر معمولی عجائب آفرینی ہے، اور صاف نظر آ رہا ہے کہ قدرت کا مخفی ہاتھ کسی مقصد سے ایک خاص ہستی تیار کر رہا ہے اور زمانہ کی عام رفتار تھم گئی ہے تاکہ اس کی راہ صاف ہو جائے۔

(۳) اس کے بعد ان کی تین بڑی مہموں کا ذکر آتا ہے ایک مغرب الشمس[۱] کی طرف

---

[۱] یاد رہے کہ پچھم اور پورب کیلئے مغرب الشمس اور مطلع الشمس کی تعبیر تورات میں اکثر پائی جاتی ہے۔ مثلاً ذکریا کی کتاب میں ہے "رب الافواج فرماتا ہے میں اپنے لوگوں کو سورج نکلنے کے ملک اور اس کے ڈوبنے کے ملک سے چھڑا لوں گا!" (۸:۷)

فی التورات الا فی مکان واحد" قال، ومن ؟ قالوا: ذوالقرنین یعنی یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اس نبی کی نسبت ہمیں خبر دیجئے جس کا نام تورات میں صرف ایک ہی مقام پر آیا ہے۔

آپ نے فرمایا۔ وہ کون ؟ کہا۔ ذوالقرنین۔ چونکہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا اشارہ صرف دانیال نبی کے خواب ہی میں آیا ہے۔ اس لئے یہودیوں کا یہ بیان ٹھیک ٹھیک اسی طرف اشارہ تھا۔

علاوہ بریں سائرس کے تمثال کے انکشاف نے قطعی طور پر یہ بات آشکارا کر دی ہے کہ اس کے سر پر دو سینگوں کا تاج رکھا گیا تھا۔ اور یہ فارس اور مادہ کی سلطنتوں کے اجتماع واتحاد کی علامت تھی۔

(۲) اس کے بعد قرآن کی تصریحات سامنے لاؤ سب سے پہلا وصف جو اس کا بیان کیا ہے، یہ ہے کہ "انا مکنا لہ۔ فی الارض، وآتینٰہ من کل شئی سببا" (۸۴) ہم نے اسے زمین میں قدرت دی تھی اور ہر طرح کا ساز وسامان مہیا کر دیا تھا۔ قرآن جب کبھی انسان کی کسی کامرانی و خوشحالی کو براہ راست خدا کی طرف منسوب کر کے کہتا ہے جیسا کہ یہاں کہا ہے، تو اس سے مقصد عموماً کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو عام حالات کے خلاف محض اس کے فضل وکرم سے ظہور میں آئی ہو۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کی نسبت فرمایا، "کذالک مکنا لیوسف فی الارض" ۱۲: ۵۶

اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف علیہ السلام کو حکومت دے دی، کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ کو ہر طرح کے ناموافق حالات میں محض فضل الٰہی سے ایک غیر معمولی بات حاصل ہو گئی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ عام حالات کے مطابق ظہور میں

مغربی مہم

اوپر پڑھ آئے ہو کہ سائرس نے ابھی فارس اور میڈیا کا تاج سر پر رکھا ہی تھا کہ ایشیائے کوچک کے بادشاہ کروئسس نے حملہ کر دیا۔ ایشیائے کوچک [illegible] بادشاہت جو لیڈیا کے نام سے مشہور رہی، پچھلی صدی کے ابتدا ابھری تھی [illegible] کا دارالحکومت سارڈیس تھا۔ سائرس کی تخت نشینی سے پہلے میڈیا اور [illegible] میں کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔ بالآخر کروئسس کے باپ نے سائرس کے نانا استیاگ کے باپ سے صلح کر لی، اور باہمی اتحاد کے استحکام کے لئے باہمی ازدواج کا رشتہ قائم ہو گیا۔ لیکن کروئسس نے یہ تمام عہد و پیمان اور باہمی علائق بھلا دیئے۔ سائرس کی یہ کامرانی برداشت نہ کر سکا۔ کہ فارس اور میڈیا کی مملکتیں متحد ہو کر ایک عظیم مملکت کی حیثیت اختیار کر رہی ہے۔ اس نے پہلے بابل، مصر اور اسپارٹا کی مملکتوں کو اس کے خلاف ابھارا، اور پھر اچانک حملہ کر کے سرحدی شہر پیٹریا پر قبضہ کر لیا۔

اب سائرس مجبور ہو گیا کہ بلا توقف وہ اس حملہ کا مقابلہ کرے وہ میڈیا کے دارالحکومت ہگ متانہ سے جو اب ہمدان کے نام سے پکارا جاتا ہے (حاشیہ

یعنی پچھم کی طرف۔ ایک مطلع الشمس کی طرف یعنی پورب کی طرف۔ تیسری ایک ایسے مقام تک جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی اور یاجوج ماجوج وہاں آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔ اب دیکھو یہ تمام تفصیلات کس طرح ٹھیک ٹھیک سائرس کی فتوحات پر منطبق ہوتی ہیں۔

یہ لشکر کشی جو اسے پیش آئی، یہ مغرب کی لشکر کشی تھی کیونکہ وہ ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کے مغربی کنارے تک پہنچ گیا۔ یہ اس کے لئے مغرب الشمس کی آخری حد تھی ۔

ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل نقشہ میں نکالو تم دیکھو گے کہ تمام ساحل اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں اور سمرنا کے قریب اس طرح کے جزیرے نکل آئے ہیں ۔ جنہوں نے ساحل کو ایک جھیل یا حوض کی سی شکل دے دی ہے ۔ لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور اس کا محل موجودہ سمرنا سے بہت زیادہ فاصلے پر نہ تھا پس جب سائرس سارڈیس کی تسخیر کے بعد آگے بڑھا ہوگا تو یقیناً ایجیئن کے اسی ساحلی مقام پر پہنچا ہوگا۔ جو سمرنا کے قریب واقع ہے۔ یہاں اس نے دیکھا ہوگا کہ سمندر نے ایک جھیل کی سی شکل اختیار کر لی ہے۔ ساحل کے قریب پانی گدلا ہو رہا ہے اور شام کے وقت اسی میں سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی صورت حال کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ "وجدہا تغرب فی عین حمئۃ" (۸۶) اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے ۔

یہ ظاہر ہے کہ سورج کسی مقام میں بھی ڈوبتا نہیں، لیکن ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں تو ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ ایک سنہری تھالی آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوب رہی ہے ۔

نکلا اور اس تیزی کے ساتھ بڑھا کہ صرف دو جنگوں کے بعد جو پٹیریا اور سارڈیس کے قریب واقع ہوئی تھیں لیڈیا کی تمام مملکت پر قابض ہو گیا۔

ہیروڈوٹس نے اس جنگ کی سرگزشت پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور اس کی بعض تفصیلات نہایت دلچسپ اور اہم ہیں لیکن یہ موقع اطناب کا نہیں۔ وہ کہتا ہے سائرس کی فتح مندی ایسی عجیب اور معجزانہ تھی کہ پٹیریا کے معرکہ کے بعد صرف چودہ دن کے اندر لیڈیا کا مستحکم دارالحکومت مسخر ہو گیا اور کروسس ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے سائرس کے آگے سرنگوں کھڑا تھا۔

اب تمام ایشیائے کوچک بحر شام سے لے کر بحر اسود تک اس کے زیر نگیں تھا۔ وہ برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ قدرتی طور پر اس کے قدم یہاں پہنچ کر اسی طرح رک گئے۔ جس طرح بارہ سو سال بعد طارق کے قدم افریقہ کے شمالی ساحل پر رک جانے والے تھے۔ اس کے فتحمند قدموں کے لئے صحراؤں کی وسعتیں اور پہاڑوں کی بلندیاں روک نہ ہو سکیں سمندر فارس سے لے کر لیڈیا تک چودہ سو میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا لیکن سمندر کی موجوں پر چلنے کے لئے اس کے پاس کوئی سواری نہ تھی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حد نظر تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا، اور سورج اس کی لہروں میں ڈوب رہا تھا۔

حاشیہ ص ۵۱ کا: عزرا کے کتبوں میں اس کا نام یہی آیا ہے مگر ہیرو ڈوٹس وغیرہ یونانی مورخین نے اسے اک تبانا لکھا ہے اور یہی نام یورپ میں مشہور ہو گیا تھا۔

من دونہا ستر ا (۹۰) جب وہ مشرق کی طرف پہنچا تو اسے ایسی قوم ملی سورث کے لئے کوئی آنٹ نہیں رکھتی تھی یعنی مانہ بدوش قبائل تھے۔

یہ خانہ بدوش قبائل کون تھے۔ ان مورخین کی بد احتیاط سے ملتا تھا بکٹریا یعنی بلغ کے علاقہ کے قبائل تھے نقشہ پر اگر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آجائے گا کہ بکٹریا۔ کلہ یک ٹھیک ایران کے لئے مشرق اقصیٰ کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اس کے آگے پہاڑ ہیں اور انہوں نے راہ روک دی ہے۔ اس کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ گیڈروسیا کے وحشی قبیلوں نے اس کی مشرقی سرحد میں بدامنی پھیلائی تھی اور ان کی گوشمالی کے لئے اسے نکلنا پڑا۔ گیڈروسیا سے مقصود وہی علاقہ ہے جو آج کل مکران کہلاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کی طرف ہمیں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ مکران سے پیچھے اس کے قدم نہیں اترے ہوں گے اور اگر اترے ہوں گے تو دریائے سندھ سے آگے نہیں بڑھے ہوں گے۔ کیونکہ دارا کے زمانہ میں بھی اس کی جنوب مشرقی سرحد دریائے سندھ ہی تک معلوم ہوتی ہے۔

مشرق مہم

دوسری لشکرکشی شرق کی طرف تھی۔ چنانچہ ہیروڈوٹس اور ٹی سیاس[1] دونوں اس کی مشرقی لشکرکشی کا ذکر کرتے ہیں جو لیڈیا کی فتح کے بعد اور بابل کی فتح سے پہلے پیش آئی تھی۔ اور دونوں نے تصریح کی ہے کہ مشرق کے بعض وحشی اور صحرانشین قبائل کی سرکشی اس کا باعث ہوئی تھی۔ یہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے اس ارشاد کی تصدیق ہے کہ "حتی اذا بلغ الشمس، وجدہا تطلع علی قوم لم نجعل لھم

---

(۱) ٹی سیاس ایک یونانی تھا جو ۳۹۸ قبل مسیح سے لے کر ۴۱۴ ق م تک شہنشاہ ارتخششتا نی یلوس کا درباری طبیب رہا اور اس زمانہ کے کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی مشہور تاریخ لکھی۔ بعد کے تاریخ نویسوں نے اس کے بعض بیانات شبہہ کی نگاہ سے دیکھے ہیں اور اس لئے اسے ستناد کا وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جو ہیروڈوٹس (المتولد ۴۸۴ ق م) کی تاریخ کو حاصل ہوا ہے مگر موجودہ زمانے کے محققین تاریخ کا ایسا خیال نہیں ہے۔

ایک قدرتی دیوار کا کام دے رہا ہے بس اگر شمالی قبائل کے حملوں کے لئے کوئی راہ باقی رہی تھی، تو وہ صرف اس سلسلہ کوہ کا ایک عریض درہ یا وسطی وادی تھی اور یقیناً وہیں سے یاجوج ماجوج کو دوسری طرف پہنچنے کا موقع ملتا تھا اس راہ کے بند ہو جانے کے بعد نہ صرف بحر خزر سے لے کر بحر اسود تک کا علاقہ محفوظ ہو گیا بلکہ سمندروں اور پہاڑوں کی ایک ایسی دیوار قائم ہو گئی جس نے تمام مغربی ایشیا کو اپنی پاسبانی میں لے لیا اور شمال کی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ اب ایران۔ شام، عراق، عرب ایشیائے کوچک بلکہ مصر بھی شمال کی طرف سے بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔

نقشہ میں یہ مقام دیکھو۔ تمام مغربی ایشیا نیچے ہے۔ اوپر شمال میں بحر خزر ہے اس سے بائیں جانب شمال مغرب میں بحر اسود ہے درمیان میں بحر خزر کے مغربی ساحل سے بحر اسود کے مشرقی ساحل تک کاکیشیا کا سلسلہ کوہ چلا گیا ہے۔ ان دو سمندروں اور درمیان کے سلسلہ کوہ نے مل کر سینکڑوں میلوں تک ایک قدرتی روک پیدا کر دی ہے اب اس روک میں اگر کوئی شگاف رہ گیا تھا جہاں سے شمالی اقوام کے قدم اس روک کو لانگ سکتے ہیں تو وہ صرف یہی دو پہاڑوں کے درمیان کی راہ تھی۔ ذوالقرنین نے اسے بھی بند کر دیا، اور اس طرح شمالی اور مغربی ایشیا کا یہ درمیانی پھاٹک پوری طرح مقفل ہو گیا۔

باقی رہا یہ سوال کہ وہاں جو قوم ذوالقرنین کو ملی تھی اور جو بالکل ناسمجھ تھی، وہ کون سی قوم تھی؟ تو اس سلسلہ میں دو قومیں نمایاں ہوتی ہیں، اور دونوں کا اس زمانہ میں وہاں قریب قریب آباد ہونا تاریخ کی روشنی میں آچکا ہے پہلی قوم

شمالی مہم

تیسری لشکر کشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں یاجوج ماجوج کے حملے ہوا کرتے تھے یہ یقیناً اس کی شمالی مہم تھی جس میں وہ بحر خزر (کاسپین) کو دہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا کے سلسلہ کوہ تک پہنچ گیا تھا۔ اور وہاں اسے ایک درّہ ملا تھا جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا اسی راہ سے یاجوج ماجوج آکر اس طرف کے علاقے میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے، اور یہیں اس نے سد تعمیر کی۔

قرآن نے اس مہم کا حال ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ "حتی اذا بلغ بین السدین وجد من دونہما قوما لا یکادون یفقہون قولا" (۹۳)

یہاں تک کہ وہ دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچ گیا۔ ان کے اس طرف اسے ایک قوم ملی جو کوئی بات بھی نہیں سمجھ سکتی تھی پس معلوم ہوتا ہے "سدین" سے مقصود کاکیشیا کا پہاڑی درّہ ہے کیونکہ اس کے داہنی طرف بحر خزر ہے۔ جس نے شمال اور مشرق کی راہ روک دی ہے۔ بائیں جانب بحر اسود ہے جو شمال مغرب کے لئے قدرتی روک ہے۔ درمیانی علاقے میں اس کا سر بفلک سلسلہ کوہ

خواہ سزا دے، خواہ انہیں اپنا دوست بنالے۔ یقیناً یہ لیڈیا کی یونانی قوم تھی۔ اس کے پادشاہ کروئسس نے تمام عہد و پیمان اور باہمی رشتہ داریاں بھلا کر بلاوجہ سائرس پر حملہ کیا تھا اور صرف خود ہی حملہ آور نہیں ہوا تھا بلکہ وقت کی تمام طاقتور حکومتوں کو بھی اس کے خلاف ابھار کر اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ اب جب تائید الٰہی نے اپنا کرشمہ دکھایا اور تمام لیڈیا مسخر ہو گیا۔ تو حکم الٰہی ہوا یہ لوگ بالکل تیرے رحم پر ہیں۔ تو جو چاہے ان کے ساتھ کر سکتا ہے کیونکہ یہ اپنے ظلم و شرارت کی وجہ سے ہر طرح سزا کے مستحق ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ تائید الٰہی نے تیرا ساتھ دیا۔ دشمنوں کو مسخر کر دیا۔ اب وہ بالکل تیرے اختیار میں ہیں، لیکن تجھے بدلہ نہیں لینا چاہیئے۔ وہی کرنا چاہیئے جو نیکی اور فیاضی کا مقتضا ہے۔ چنانچہ ذوالقرنین نے ایسا ہی کیا۔ "قال اما من ظلم فسوف نعذبہ ثم یرد الی ربہ فیعذبہ عذابا نکرا" "واما من آمن وعمل صالحا فلہ جزاء الحسنیٰ وسنقول لہ من امرنا یسرا" (۸۸)

اس نے اعلان کیا کہ میں پچھلے جرم کی بنا پر کسی کو سزا نہیں دینی چاہتا میری جانب سے عام بخشش کا اعلان ہے۔ البتہ آئندہ جو کوئی برائی کرے گا۔ بلاشبہ اسے سزا دوں گا پھر اسے مرنا ہے اور آخرت کا عذاب سخت جھیلنا ہے اور جو لوگ میرے احکام مانیں گے اور نیک کردار ثابت ہوں گے تو ان کے لئے ویسا ہی بہتر اجر بھی ہو گا اور وہ میرے احکام بھی بہت آسان پائیں گے۔ یعنی بندگانِ خدا پہ سختی کرنا نہیں چاہتا۔ یہ ہو بہو اس طرز عمل کی تعبیر ہے جس کی تفصیل ہمیں یونانی تاریخوں کے صفحات میں ملتی ہے، اور جسے زمانہ حال کے تمام محققین تاریخ نے ایک مسلمہ

رہ ہے جو بحر خزر کے مشرقی ساحل پر آباد تھی۔ اسے یونانی مورخوں نے "کاسپین" کے نام سے پکارا ہے، اور اسی کے نام سے بحر خزر کا نام بھی "کاسپین" پڑ گیا ہے۔ دوسری قوم وہ ہے جو اس مقام سے آگے بڑھ کر علیین کا کیتیا کے دامن میں آباد تھی۔ یونانیوں نے اسے "کولچی" یا "کولشی" کے نام سے پکارا ہے، اور دارا کے کتبہ اسطر میں اس کا نام "کوشیہ" آیا ہے[1] ان ہی دو قوموں میں سے کسی نے یا دونوں قوموں نے ذوالقرنین سے یاجوج ماجوج کی شکایت کی ہوگی، اور چونکہ یہ غیر متمدن قومیں تھیں، اس لیئے ان کی نسبت فرمایا کہ ــــ لایکادون یفقہون قولا ــــ!

(۴) اس کے بعد ذوالقرنین کا جو وصف سامنے آتا ہے وہ اس کی عدالت گستری اور خدمت انسانی کی فیاضانہ سرگرمی ہے، اور یہ اوصاف سائرس کی تاریخی سیرت کی اس درجہ آشکارا حقیقتیں ہیں کہ مورخ کی نگاہ کسی دوسری طرف اٹھ ہی نہیں سکتی۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مغرب میں جو قوم ملی تھی، اس کی نسبت حکم الٰہی ہوا تھا: "یاذا القرنین! اما ان تعذب، واما ان تتخذ فیہم حسنا" (۸۶) یعنی یہ قوم اب تیرے بس میں ہے۔ جس طرح تو ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے۔

---

[1] دارا یوس اول کا یہ کتبہ تاریخ قدیم کا ایک نہایت قیمتی سرمایہ ہے اس میں اس نے اپنے تمام مفتوحہ ممالک اور زیر حکومت صوبوں کے نام گنا دیئے ہیں جو تعداد میں ۲۸ ہیں، ان میں سے اکثر ناموں کا جغرافیائی محل روشنی میں آچکا ہے صرف ایک دو ناموں کی حقیقت اب تک محل غور و بحث ہے ــــ!

کی بشارت دی تھی۔ پس قدرتی طور پر واقعات کی یہ رفتار یونانیوں کے لئے خوشگوار نہ ہو سکی اور اس امر کی کوشش شروع ہو گئی کہ اس شکست میں بھی اخلاقی اور مذہبی فتحمندی کی رشنات پیدا کر دی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کروئسس کا معاملہ اچانک ایک پراسرار افسانہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور یونانی دیوتا اپنے سارے معجزوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہیرو ڈوٹس سلہ لیڈیا کے باشندوں کی یہ روایت نقل کرتا ہے کہ ڈلیفی کے ہاتف کا جواب غلط نہ تھا، مگر کروئسس نے جنگ کے جوش و طلب میں اس کا صحیح مطلب نہیں سمجھا۔ ہاتف نے کہا تھا "اگر اس نے پارسیوں پر حملہ کیا تو وہ ایک بڑی مملکت تباہ کر دے گا" یعنی خود اپنی مملکت تباہ کر دے گا، مگر اس نے خیال کیا۔ بڑی مملکت سے مقصود پارسیوں کی مملکت ہے۔ نیز وہ کہتا ہے: پہلے سائرس نے

(حاشیہ صفحہ ۶۰) یہ اگرچہ اس کے لئے مترادف لفظ نہیں ہے لیکن اصطلاح کا مطلب بہتر طریقہ پر واضح کرتا ہے۔

یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ مندروں میں ہاتف غیبی کی صدائیں سنی جاتی ہیں اور خاص پجاریوں پر دیوتاؤں کا الہام ہوتا ہے۔ اس غرض سے خاص خاص مندروں کی شہرت تھی۔ لوگ چڑھاوے چڑھا کر اپنے سوالات پیش کرتے اور مجاوروں دیوتاؤں کی طرف سے جوابات سنا دیتے۔

سلہ ہیرو ڈوٹس مترجمہ اے ڈی گاڈلی

Lued edition (Godley)

تاریخی حقیقت تسلیم کرلیا ہے۔

تمام یونانی مورخین بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ سائرس نے فتح کے بعد باشندگانِ لیڈیا کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ صرف منصفانہ ہی نہ تھا وہ اُس سے بھی زیادہ تھا۔ وہ فیاضانہ تھا۔ وہ اگر اپنے دشمنوں کے ساتھ سختی کرتا تو یہ انصاف ہوتا، کیونکہ زیادتی اِن ہی کی تھی۔ لیکن وہ صرف منصف ہونے پر قانع نہیں ہوا۔ اس نے رحم و بخشش کا شیوہ اختیار کیا۔ ہیرو ڈوٹس لکھتا ہے کہ سائرس نے اپنی فوج کو حکم دے دیا تھا کہ دشمن کی فوج کے علاوہ اور کسی انسان پر ہتھیار نہ اٹھایا جائے اور دشمن کے فوج میں سے بھی جو کوئی نیزہ جھکا دے اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے۔ کروئسس شاہ لیڈیا کی نسبت صریح حکم تھا کہ کسی حال میں بھی اسے گزند نہ پہنچائی جائے اگر وہ مقابلہ کرے، جب بھی اُس پر تلوار نہیں اٹھانی چاہیئے۔ اس حکم کی فوج نے اس دیانت داری کے ساتھ تعمیل کی کہ باشندوں کو جنگ کی مصیبت ذرا بھی محسوس نہ ہوئی۔ یہ گویا محض فرمانروائی خاندان کا ایک شخصی انقلاب تھا کہ کروئسس کی جگہ سائرس نے لے لی۔ اس سے زیادہ کوئی انقلاب ملک و قوم کو محسوس ہی نہیں ہوا۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سائرس کی فتح یونانی دیوتاؤں کی شکست تھی کیونکہ وہ اس مصیبت سے اپنے پرستار کروئسس کو نہ بچا سکے، حالانکہ حملہ سے پہلے اس نے مندروں کے ہاتف[1] سے استصواب کرلیا تھا، اور ڈیلفی کے ہاتف نے فتح و کامرانی

---

[1] ہم نے (Oracle) کے لئے ہاتف کا لفظ استعمال کیا ہے۔ صفحہ ۱۶ پر ملاحظہ کریں

قرآن نے ذوالقرنین کا یہ اعلان نقل کیا ہے کہ آئندہ جو ظلم کرے گا، سزا پائے گا، جو حکم مانے گا اور نیک عمل ہو گا اسے انعام ملے گا۔ بعینہ زینوفن کی بھی ایسی ہی روایت ہے۔ قرآن میں کہا ہے کہ " وسنقول لہ من امرنا یسرا" اگر لوگوں نے نیک عمل اختیار کی تو دیکھ لیں گے میرے احکام و قوانین میں ان کے لیے سختی نہ ہوگی۔ تمام مورخین بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ اس کے احکام و قوانین ایسے ہی تھے۔ وہ مفتوحہ ممالک کے باشندوں کے لیے سرتاسر شفقت و رحمت تھا۔ اس نے ان تمام بوجھل ٹیکسوں اور خراجوں سے رعایا کو نجات دے دی جو اس عہد کے تمام حکمراں وصول کیا کرتے تھے، اس نے جس قدر احکام و فرامین نافذ کئے وہ زیادہ سے زیادہ نرم اور زیادہ سے زیادہ ہلکے تھے۔

(۵) یہ تو صرف اس کی مغربی فتح مندی کی سرگزشت تھی۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اعمال کی عام رفتار کیسی رہی؟ اور قرآن کا بیان کردہ وصف کہاں تک اس پر راست آتا ہے؟

لیکن قبل اس کے ہم یونانی مورخوں کی شہادتوں پر متوجہ ہوں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ یونانی مورخ سائرس کے ہم قوم نہیں تھے، ہم وطن نہیں تھے، ہم مذہب نہیں تھے، اتنا ہی نہیں بلکہ دوست بھی نہیں تھے۔ سائرس نے لیڈیا کو شکست دی تھی، اور لیڈیا کی شکست یونانی، قومیت، یونانی تہذیب اور سب سے زیادہ یہ کہ یونانی مذہب کی شکست تھی پھر سائرس نے جانشینوں کے لئے براہِ راست یونانیوں کو زیر کیا تھا اور ہمیشہ کے لیے دونوں قومیں ایکدوسرے

حکم دیا تھا کہ لکڑیوں کی چتا تیار کی جائے اور اس پر کروئسس کو بٹھا کر آگ لگا دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ لیکن پھر جب کروئسس کی بعض باتیں سنیں تو بے حد متاثر ہوا، اور آگ بجھانے کا حکم دیا لیکن اب آگ پوری طرح مشتعل ہو گئی تھی۔ ممکن نہ تھا کہ اسے فوراً بجھا دیا جائے یہ حال دیکھ کروئسس نے اپالو دیوتا کو پکارا، اور باوجودیکہ آسمان بالکل صاف تھا اچانک بارش شروع ہو گئی اور اس طرح اس معجزے نے بروقت ظاہر ہو کر اس کی جان بچا لی۔

لیکن خود ہیروڈوٹس اور زینوفن کی تصریحات سے جو حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ سائرس یا تو کروئسس کے عزم و صبر کا امتحان لینا چاہتا تھا یا یہ بات آشکارہ کر دینی چاہتا تھا کہ یونانیوں کے خود ساختہ دیوتا اپنے عبادت گزاروں کی کچھ مدد نہیں کر سکتے اور جن دیوتاؤں کی مزعومہ بشارت پر اعتماد کر کے جنگ کی گئی تھی۔ ان میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنے پرستار کو زندہ جلنے کے عذاب سے بچا لیں۔ یعنی مقصود یہ تھا کہ پہلے اسے چتا پر بٹھایا جائے۔ آگ بھی لگا دی جائے لیکن وہ جب خود اور تمام لوگ دیکھ لیں کہ دیوتاؤں کا کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا تو پھر اسے بخش دے، اور عزت و احترام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے جائے دوسری علت زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے کیونکہ خود ہیروڈوٹس کی روایت میں اس کی جھلک موجود ہے، اور یونانی افسانہ میں اپالو کے معجزہ کی نمود بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سائرس نے اپنے عمل سے جو حقیقت آشکارا کر دی تھی یونانی افسانہ نے اس کا توڑ کرنے کے لئے اپالو کا معجزہ گڑھ لیا۔

کو ظلم سے نجات دلائے، درماندہ انسانوں کا ہاتھ پکڑے غم زدوں کے دکھ درد میں شریک ہو۔ پھر ان تمام عالی صفتوں کے عاجزی اور انکساری اس کے حسن کمال کا سب سے بڑا زیور تھی اس نے ایک ایسے تخت پر بیٹھ کر جس کے آگے تمام قوموں کے سر جھک گئے تھے اور ایک ایسے خزانے کا مالک ہو کر جس میں تمام دنیا کی دولت سمٹ آئی تھی، کبھی گوارا نہ کیا کہ فخر و غرور کا پندار اغ میں جگہ دے ۔

ہیروڈوٹس لکھتا ہے:

"وہ ایک نہایت مخیر بادشاہ تھا۔ اسے دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح دولت جمع کرنے کی حرص نہیں تھی، بلکہ جود و سخاوت کا جوش تھا۔ وہ کہتا تھا، سب سے بڑی دولت یہ ہے کہ نوع انسانی کی بھلائی کا موقع ملے اور مظلوموں کی دادرسی ہو سکے۔"

ژنوسیاز لکھتا ہے:

"اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت بادشاہوں کے ذاتی عیش و آرام کے لئے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کی جائے اور ماتحتوں کو اس سے فیض پہنچے۔ چنانچہ اس کی اس فیض رسانی نے اس کی تمام رعایا کے دل اس کے ہاتھوں میں دے دیئے تھے۔ وہ اس کے لئے خوشی خوشی اپنی گردنیں کٹوا دیتے۔"

سب سے زیادہ نمایاں بات جو ان تمام مورخوں کے صفحات پر ملتی ہے، وہ سائرس کی شخصیت کا غیر معمولی نمود ہے۔ سب کہتے ہیں کہ وہ جسم و چہرہ میں

کی حریف ہو گئی تھیں۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ یونانی دماغ اپنے حریف کی مدحت سرائی کا شائق ہو گا تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مورخ اس کی غیر معمولی عظمتوں اور ملکوتی صفات کی مدحت سرائی میں سب رطب اللسان ہے اور اس لیے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے محاسن نے ایک ایسے عالمگیر اعتراف و تاثر کی نوعیت اختیار کر لی تھی کہ دوست و دشمن کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ سب کے دلوں میں ان کا اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔ سب کی زبانوں پر ان کی مدحت سرائی تھی، اور محاسن وہی ہیں جن کی حریفوں کو بھی شہادت دینی پڑے۔

ومليحة شهدت بها ضراتها
والفضل ما شهدت بالأعداء

زینوفن لکھتا ہے:

"سائرس ایک نہایت دانشمند، سنجیدہ اور سادہ ہی رحمدل فرمانروا تھا۔ اس کی شخصیت ہر طرح کے شاہی اوصاف اور حکیمانہ فضائل کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھی یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی کہ اس کی شوکت و حشمت سے کہیں زیادہ اس کی دانائی ہو گئی اور سیر چشمی تھی اور اس کی فیاضی اور رحمدلی اپنی کوئی دوسری مثال نہیں رکھتی انسان کی خدمت اور ہمدردی اس کی شاہانہ طبیعت کا سب سے بڑا جوہر تھا۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ مصیبت زدہ انسانوں کی خبر گیری کرے، مظلوموں کی

سائنس اور سکندر

سکندرِ اعظم کو ارسطو کی تعلیم و تربیت نے تیار کیا تھا اور بلاشبہ وہ بہت بڑا فاتح نکلا۔ لیکن کیا انسانیت و اخلاق کا بھی کوئی گوشہ فتح کرسکا؟ سائنس کے لئے ہمیں کوئی ارسطو نہیں ملتا اس نے انسانی حکمت کی درسگاہ کی جگہ قدرت کی درسگاہ میں پرورش پائی تھی تاہم اس نے سکندر کی طرح غیر ملکوں ہی کو نہیں بلکہ انسانیت و فضائل کی مملکتوں کو بھی مسخر کرلیا تھا۔

سکندر کی تمام فتوحات کی عمر اس سے زیادہ نہ تھی جتنی خود اس کی عمر تھی لیکن سائنس کی فتوحات نے اپنی جڑیں جما دی تھیں، وہ دو سو برس تک نہ ہل سکیں۔ سکندر کے دم توڑتے ہی اس کی مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے

پیدا ہوا، اس کی مخلوق نہیں تھا. ایک بالاتر شخصیت تھی جسے قدرت نے اپنا کرشمہ دکھانے کے لئے نمودار کر دیا تھا. دنیا کے کسی حکیم نے اس کی تربیت نہیں کی. وقت کے متمدن لنکا سلیماسے کسی ملک میں کوئی پرورش نہیں ہوئی. وہ محض قدرت کا پروردہ تھا، اور قدرت ہی کے ہاتھوں نے اسے اٹھایا تھا. اس کی تمام ابتدائی زندگی صحراؤں کی گود اور پہاڑوں کی آغوش میں بسر ہوئی وہ فارس کے مشرقی پہاڑوں کا چرواہا تھا. تاہم یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چرواہا جب دنیا کے سامنے آیا، تو حکمرانی کا سب سے بڑا جلوہ، دانش کا سب سے بڑا پیکر فضیلت کا سب سے بڑا نمونہ اس کے سامنے تھا۔

قساوت قلبی، اور سلبعیت انگیز طریق تعذیب کی چھوٹی سے چھوٹی مثال بھی سائرس قدیم تاریخ کی سب سے بڑی شخصیت ہے جس میں بیک وقت فتوحات کی وسعت، فرمانروائی کی عظمت، اور اخلاق و انسانیت کی فضیلت جمع ہوگئی تھی اور وہ جس عہد میں ظاہر ہوا، اس عہد میں اس کی شخصیت ہر اعتبار سے انسانیت کا ایک پیام اور قوموں کی نجات تھی۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر جی، بی، گرنڈی جو موجودہ زمانے میں تاریخ قدیم کے ایک مستند ماہر ہیں اور جن کی کتاب گریٹ پرشین وار بہت مقبول ہو چکی ہے، لکھتے ہیں:-

"یہ حقیقت بالکل آشکارا ہے کہ سائرس کی شخصیت اپنے عہد کی ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔ اُس نے اپنی تمام معاصر قوتوں کے دلوں پر اپنا حیرت انگیز تاثر نقش کر دیا۔ اس کی ابتدائی نشوونما بالائی فارس کے غیر آباد اور دور دراز گوشوں میں ہوئی۔ جس کی سرگزشت نے ایک افسانہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کی ابتدائی تربیت کی روایتیں اس سے ڈیڑھ سو برس بعد زینوفن نے مدوّن کیں جو سقراط کا شاگرد تھا، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام روایتوں میں اس کے فضائل انسانیت، کا جوہر عام طور پر نمایاں ہے خواہ ہم ان روایتوں کو اہمیت دیں، خواہ نہ دیں۔ تاہم یہ حقیقت ہر حال میں غیر متزلزل رہتی ہے کہ اس کے تدبر و سیاست کا دامن اس کی انسانیت و فضیلت کے جوہر سے بندھا ہوا تھا۔

لیکن سائرس نے جب دنیا چھوڑی تو اس کی مملکت روز بروز وسیع و مستحکم ہونے والی تھی۔ اس کی فتوحات میں صرف مصر کا خانہ خالی رہ گیا تھا۔ اس کے فرزند کیقباد نے اسے بھی بھر دیا، اور پھر چند برسوں کے بعد دنیا کی وہ عالمگیر سلطنت ظہور میں آگئی۔ جو ایشیاء افریقہ اور یورپ کے اٹھائیس ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی اور اس پر سائرس کا جانشین دارا یوش تن تنہا حکمراں تھا۔

سکندر کی فتوحات صرف جسم کی فتوحات تھیں۔ جنہیں قہر وطاقت نے سر کیا تھا لیکن سائرس کی فتوحات روح و دل کی فتوحات تھیں جنہیں انسانیت اور فضیلت نے سر کیا تھا۔ پہلی سر اٹھاتی ہے لیکن ٹک نہیں سکتی۔ دوسری ٹک جاتی ہے اور پھر ٹلتی نہیں۔

سائرس فتح بابل کے بعد دس برس تک زندہ رہا۔ اب اس کی حکومت عرب سے لیکر بحر اسود تک اور ایشیائے کوچک سے بلخ تک پھیلی ہوئی تھی، اور ایشیا کی تمام قومیں اس کے ماتحت آچکی تھیں، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس تمام عرصہ میں بغاوت اور سرکشی کا ایک حادثہ بھی نہیں ہوا کیونکہ زینوفن کے لفظوں میں "وہ صرف پادشاہ ہی نہ تھا بلکہ انسانوں کا شفیق مربی اور قوموں کا رحیم باپ تھا"۔ اور رعایا سخت گیر حکمرانوں سے بغاوت کر سکتی ہے لیکن اولاد اپنے شفیق باپ سے باغی نہیں ہو سکتی۔ موجودہ زمانے کے تمام مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت تھی، یہ ایسی خصوصیت تھی جو آگے چل کر رومن ایمپائر کو بھی نصیب نہ ہوئی۔

سب متفقہ شہادت دیتے ہیں کہ اس عہد کے پادشاہوں کی سخت گیری

تازیانوں سے مجرموں کو نہیں پیٹا جاتا تھا۔ اب قتل عام کے احکامات صادر نہیں ہوتے تھے۔ اب قوموں اور قبیلوں کو جلاوطن نہیں کیا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کورس نے آشوری اور بابلی بادشاہوں کے تمام مظالم کے اثرات یک قلم محو کر دیئے۔ جلا وطن قومیں اپنے وطنوں میں لوٹائی گئیں، ان کے معبد اور معبود انہیں واپس دے دیئے گئے، قدیم رسموں اور عبادتوں کے خلاف کوئی جبر و تشدد باقی نہیں رہا۔ ہر قوم کے ساتھ پوری طرح دادرسی کی گئی ہر مذہب کے پیروؤں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی۔ دنیا کی گزشتہ عالمگیر دہشت ناکی کی جگہ ایک عالمگیر رواداری اور عفو و بخشش کا مبارک دور شروع ہو گیا![1]

غور کرو قرآن نے چند لفظوں کے اندر جو ارشادات کر دیئے ہیں آج تاریخ کا داستان سرا کس طرح اس کے ایک ایک حرف کی شرح و تفصیل سنا رہا تھا۔

(۱) اب چند لمحوں کے لئے ان تصریحات پر غور کرو جو تورات کے صحائف میں مندرج ہیں۔ کس طرح وہ سائرس کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت

---

[1] پروفیسر موصوف کے اس مقالہ کے لئے یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ کی دوسری جلد صفحہ ۱۰۸۵ کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو جے اے ہمرٹن نے مرتب کی ہے اور حال میں شائع ہوئی ہے۔

اور جب یہ خصوصیت آشوری و بابلی ——— شہنشاہوں کی
بد عملیوں کے مقابلے میں لائی جاتی ہے تو پھر اس کی شریفانہ نمود اور
زیادہ درخشندہ ہو جاتی ہے۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:-

یہ فی الحقیقت ایک حیرت انگیز کامیابی تھی بارہ برس پہلے وہ
ایک چھوٹی سی ریاست انشان کا ایک گمنام شخص تھا۔ اور اب
ایشیا کی وہ تمام مملکتیں اس کے زیر فرمان تھیں جہاں پچھلی
قوموں کی بڑی بڑی عظمتیں ظہور میں آ چکی تھیں۔ ان تمام
بادشاہوں میں جنہوں نے زمین کے مالک ہونے کے دعوے کئے تھے،
ایک بادشاہت بھی ایسی نہ تھی۔ جو اب اپنی ہستی کا کوئی مؤثر
ظہور رکھتی ہو ——— اکادی مملکت کے نیم افسانوی سارگون
سے لے کر بنوکدرزر (بخت نصر) تک سب کی مملکتیں اس کے آگے
سربسجود ہو گئی تھیں۔ وہ صرف ایک بڑا فاتح ہی نہیں تھا وہ ایک
بڑا حکمراں تھا۔ قوموں نے یہ نیا دور صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ
اس کا استقبال کیا۔ اُن دس برسوں میں جو فتح بابل کے بعد گزرے
اس کی تمام وسیع مملکت میں ایک بغاوت کا واقعہ بھی نظر نہیں
آتا۔ بلاشبہ اس کی رعایا پر اس کی طاقت کا رعب چھایا ہوا تھا
لیکن وہ کوئی وجہ نہیں رکھتی تھی کہ اس کی سخت گیری سے ہراساں ہو۔
اس کی حکومت صلب کی سزاؤں سے بالکل ناآشنا رہی۔ اب

سب سے زیادہ مہربان تھا۔ مصریوں، اکادیوں، ایلامیوں، آشوریوں اور بابلیوں سب میں انسانی حکومت عظمت کے مظاہر خوفناکی اور دہشت انگیزی کے مظاہر تھے، اور ان کی شخصیتوں نے دیوتائی الوہیت کی تقدیس سے مل کر انسانوں کے قتل و تعذیب کا ہولناک استحقاق حاصل کر لیا تھا۔ سائرس کے ظہور سے پچاس برس پہلے بنوکدزار کی شہنشاہی کا ظہور ہوا اور ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بیت المقدس پر پیہم تین حملے کر کے نہ صرف دنیا کا سب سے بڑا زرخیز علاقہ تاراج و ویران کر دیا، بلکہ فلسطین کی پوری آبادی کو اس طرح ہنکا کر بابل لے گیا کہ جو زیفس کے لفظوں میں "کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت و خونخواری کے ساتھ بھیڑوں کو مذبح میں نہیں لے جاتا!" پھر کیا ان حالات کا قدرتی تقاضا یہ نہ تھا کہ دنیا ایک نئی شخصیت کے لئے چشم براہ ہو۔ ؟ تو میں ایک نجات دہندہ کی تلاش کر رہی ہوں ؟ ایک ایسے نجات دہندہ کی جو انسانوں کے گلے کے لئے خدا کا بھیجا ہوا "چرواہا" جو ان کی بیڑیاں کاٹے اور ان کے سروں کا بوجھ ہلکا کر دے، جو دنیا کو اس ربانی صداقت کا سبق دے کہ انسانی حکمرانی نوع انسانی کی خدمت کے لئے ہونی چاہیے۔ دہشت انگیزی اور خوفناکی کے لئے نہیں۔

دنیا بادشاہوں کے ہاتھوں تنگ آ چکی تھی اسی وہ ایک "چرواہے" کے لئے مضطرب تھی۔ اور یسعیاہ نبی کے لفظوں میں خدا کا فرستادہ چرواہا نمودار ہو گیا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں زینوفن کے لفظوں میں " قوموں نے اسے قبول ہی نہیں

واضح کر رہے ہیں، اور کس طرح قرآن کے ارشادات بھی ٹھیک ٹھیک ان کی تصدیق ہیں؟ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے کہ: "خداوند کہتا ہے، خورس میرا چرواہا ہے" اور پھر یہ بھی کہا کہ "وہ میرا مسیح ہے" اور یسعیاہ نبی کا بیان اوپر گزر چکا ہے کہ وہ یابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے گا۔ اب دیکھو اس کی شخصیت ٹھیک ٹھیک ایک موعود اور منتظر نجات دہندہ کی شخصیت تھی یا نہ تھی؟۔

جب ہم اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر سائرس کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو بہ اول نظر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ اس کا ظہور ٹھیک ٹھیک ایک ایسی شخصیت کا ظہور تھا جس کے لئے وقت کی تمام قوتیں چشم براہ ہوں۔ قوموں کا انتظار ان کی زبانوں پر نہیں ہوتا۔ ان کے حالات کے قدرتی تقاضے میں ہوتا ہے۔ غور کرو، اس عہد کی رفتار زمانہ کا قدرتی تقاضا کیا تھا؟ یہ تاریخ کے صبح تمدن کی وہ نمود تھی۔ جس کی روشنی میں ہم انسانی حکمرانی کی ساری تاریکیاں پھیلی ہوتی دیکھتے ہیں۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ اس وقت تک انسانی فرمانروائی کی عظمت صرف قہر و غضب ہی کی نقاب میں رونما ہوئی تھی، اور سب سے بڑا حکمراں وہی سمجھا جاتا تھا۔ جو سب سے زیادہ انسانوں کے لئے خوفناک ہو۔ آشور بنی پال نینوا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، اس لئے کہ وہ شہروں کے جلانے اور آبادیوں کے ویران کرنے میں سب سے زیادہ بے باک تھا! بابل کی نشاۃ ثانیہ میں بنوکدنذار (؟) سب سے بڑا فاتح تھا۔ اس لئے کہ قوموں کی ہلاکت اور مملکتوں کی ویرانی میں

گوئیاں موجود ہیں۔ سائرس کو "مسیح" کہنا بلاشبہ اس کے تقدس اور الٰہی برگزیدگی کی سب سے زیادہ واضح اور قطعی اسرائیلی شہادت ہے۔

(۷) اس سلسلہ میں آخری وصف جو ذوالقرنین کا سامنے آتا ہے، وہ اس کا ایمان باللہ ہے۔ قرآن کی آیتیں اس بارے میں ظاہر و قطعی ہیں، کہ وہ ایک خداپرست انسان تھا۔ آخرت پر یقین رکھتا تھا، احکام الٰہی کے مطابق عمل کرتا تھا، اور اپنی تمام کامرانیوں کو اللہ کا فضل و کرم سمجھتا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائرس کا بھی ایسا ہی اعتقاد و عمل تھا۔

لیکن تمام پچھلی تفصیلات پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ نہیں تھا؟ یہودیوں کے صحائف کی واضح شہادت موجود ہے کہ خدا نے اسے اپنا فرستادہ اور "مسیح" کہا اور وہ نبیوں کا موعود و منتظر تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہستی خدا کی نافرمان نہیں ہوسکتی۔ جس کا "داہنا ہاتھ خدا نے پکڑا ہو" اور جس کی ٹیڑھی راہیں وہ درست کرتا جائے "یقیناً وہ خدا کا ناپسندیدہ بندہ نہیں ہوسکتا۔ خدا صرف انہی کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ جو برگزیدہ اور مقدس ہوتے ہیں اور صرف انہی کو اپنا فرستادہ کہتا ہے۔ جو اس کے چنے ہوئے اور اس کی ٹھہرائی ہوئی راہوں پر چلنے والے ہوتے ہیں۔

کیا بلکہ اسکے استقبال کے لئے بے اختیار لپکیں" کیوں کہ وہ وقت کی جستجو کا قدرتی سراغ اور زمانہ کی طلب کا قدرتی جواب تھا، اور اگر رات کی تاریکی کے بعد صبح کی روشنی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، تو ممکن نہ تھا کہ انسانی شقاوت کی اس طولانی تاریکی کے بعد صبح سعادت کی اس جہان تابی کا استقبال نہ کیا جاتا۔

غور کرو یسعیاہ نبی کا یہ جملہ صورت حال کی کیسی ہو بہو تصویر ہے کہ "وہ میرا چرواہا ہوگا۔ وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا۔ میں اس کا داہنا ہاتھ پکڑ کے قوموں کو اس کے قابو میں دے دوں گا اور بادشاہوں کی کمریں اس کے آگے کھلواڈالوں گا۔ میں اس کے آگے چلوں گا۔ ٹیڑھے راستے اس کے لئے سیدھے کر دوں گا۔" سارے مورخ گواہی دے رہے ہیں کہ وہ ایک چرواہے کی طرح آیا اور اس نے بندگانِ خدا کی رکھوالی کی۔ سب دیکھ رہے ہیں کہ اس نے جس ملک کا رخ کیا، اس کی شقاوت ختم ہوگئی، وہ جس قوم کی طرف بڑھا اس کی بیڑیاں کٹ گئیں۔ اس نے جس گروہ کے سر پر ہاتھ رکھا، اس کے سارے بوجھ ہلکے ہوگئے۔

وہ صرف بنی اسرائیل ہی کا نہیں بلکہ تمام قوموں کا نجات دہندہ تھا۔

یاد رہے کہ یسعیاہ نبی کی اس پیشین گوئی میں اسے "خدا کا مسیح" بھی کہا ہے اور تورات کی اصطلاح میں "مسیح" وہ ہوتا ہے جسے خدا اپنی برکتوں کے ظہور کیلئے برگزیدہ کرلے، اور خدا کے براہ راست ممسوح ہونے کی وجہ سے مقدس ہو۔ چنانچہ حضرت داؤد کی نسبت بھی آیا ہے کہ "مسیح" تھے۔ سائرس کی نسبت بھی یہی کہا ہے اور اسی طرح بنی اسرائیل کی نجات کے لئے ایک آخری مسیح کی پیشین

اور تحمیاہ کا ظہور رہوا۔ ان سب کی شہادتیں بھی موجود ہیں اور ان سب سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سائرس نبی اسرائیل کی ایک موعود ہستی تھی اور خدا نے اسے برگزیدگی کے لئے چن لیا تھا۔

اگر یہودیوں کا عام اعتقاد یہ تھا تو کیا ایک لمحہ کے لئے یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک بت پرست انسان کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنے کی جرأت کرتے ؟ فرض کرو یہ تمام پیشین گوئیاں سائرس کے ظہور کے بعد بنائی گئیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہودیوں ہی نے بنائیں اور یہودیوں ہی میں پھیلیں، حتیٰ کہ ان کی مقدس کتاب میں داخل ہو گئیں پھر کیا ممکن تھا کہ ایک بت پرست انسان کے لئے ایسی پیشین گوئیاں بنائی جا سکتیں ؟ کیا یہ ممکن تھا کہ ایک بت پرست کو اسرائیلی وحی کا ممدوح اور اسرائیلی نبیوں کا موعود بنا دیا جاتا۔ ؟

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اجنبیوں اور غیر اسرائیلیوں کے خلاف یہودیوں کا تعصب بہت ہی سخت تھا ان کے نسلی غرور پر اس سے زیادہ کوئی بات شاق نہیں گزرتی تھی کہ کسی غیر اسرائیلی انسان کی بزرگی کا اعتراف کریں۔ ظہور اسلام کے وقت بھی یہی عصبیت انہیں اعتراف حق سے روکتی تھی۔

" ولا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم " (۳: ۷۳)

تاہم وہ سائرس کی فضیلت کے آگے جھک گئے جو ان کے لئے ہر اعتبار سے اجنبی تھا۔ اور نہ صرف اس کی بزرگی کا اعتراف کیا بلکہ نبیوں کا موعود اور خدا کا برگزیدہ تسلیم کر لیا۔ یہ صورت حال اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ سائرس کی شخصیت ان کے لئے بڑی ہی محبوب شخصیت تھی۔ اور اس کی نرم نیک سیرتی پیش

اسرائیلی نبیوں کی شہادت

آج کل کے اصحاب نقد و نظر یسعیاہ نبی کی اس پیشین گوئی کو مشتبہ سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ یہ سائرس سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی گئی تھی، لیکن اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے جب بھی صورت حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ خود سائرس کے عہد میں جو اسرائیلی نبی موجود تھے، ان کی شہادتیں موجود ہیں اور وہ صاف کہہ رہی ہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد یہی تھا اور اسی حیثیت سے اس کا استقبال کیا تھا۔ حزقیل اور دانیال سائرس کے معاصر تھے اور دارا کے زمانہ میں حجی اور زکریاہ کے صحیفے مرتب ہوئے، اور زرکسس (اردشیر یا ارتحششت) کے عہد میں عذرا

سے انکار ہوا۔ بعضوں نے شاہنامہ کی روایت کو ترجیح دی اور گشتاسب والا قصہ تسلیم کر لیا۔ بعضوں نے یہ مدت دو ہزار برس قبل مسیح تک بڑھادی۔ اسی طرح محل کے تعین میں بھی اختلاف ہوا۔ بعضوں نے باختر، بعضوں نے خراسان، بعضوں نے میڈیا اور شمالی ایران قرار دیا۔ لیکن اب بیسویں صدی کی ابتدا سے اکثر محققین تاریخ گلڈنر کی رائے پر متفق ہو گئے ہیں! اور عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ زردشت کا زمانہ وہی تھا جو سائرس کا تھا اور گشتاسب[1] والی روایت اگر صحیح ہے تو اس سے مقصود وہی گشتاسپ ہے جو دارا کا باپ اور ایک صوبہ کا گورنر تھا۔ زردشت کا ظہور شمالی۔ مغربی ایران یعنی آذربائیجان میں ہوا جسے اوستا کے حصہ "دینی دادا" میں ایریانہ دیجو سے تعبیر کیا ہے۔ البتہ کامیابی باختر میں ہوئی جس کا گورنر گشتاشپ[2] تھا۔

اس تحقیق کے مطابق زردشت کا سال وفات تقریباً ۵۰۰ قبل مسیح سے لیکر ۵۸۳ قبل مسیح تک ہونا چاہیئے اور سائرس کی تخت نشینی بالاتفاق ۵۵۰ ق۔م میں ہوئی یعنی زردشت کی وفات کے بیس سال بعد یا عین اسی سال۔

---

[1] گشتاسپ کو یونانیوں نے ہسٹاسپیز لکھا ہے۔

[2] اے، دی۔ ویمس۔ جیکس پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی کی کتاب "انشینٹ پرشیا اینڈ ہر پرافٹ" کا مطالعہ اس باب میں کفایت کرے گا۔

اور آرٹ کار ہ تھیں کہ ان کے اعتراف میں نسلی عصبیت کا جذبہ بھی حائل نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ ایک بت پرست انسان کے لئے جو اجنبی بھی ہو یہودیوں میں ایسی محبوبیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اگر ایک بُت پرست بادشاہ نے انہیں نجات دلائی تھی۔ تو وہ اس کی شاہانہ عظمتوں کی مداحی کرتے مگر خدا کا مسیح اور برگزیدہ کبھی نہ سمجھتے۔ ضروری ہے اس کی فضیلتیں مذہبی ہوں ضروری ہے کہ مذہبی حیثیت سے بھی عقائد کا توافق موجود ہو۔ یہ یہودیوں کی پوری تاریخ میں غیر اسرائیلی فضیلت کے اعتراف کا تنہا واقعہ ہے اور ممکن نہیں کہ ایک ایسے انسان کے لئے ہو، جسے وہ مذہبی حیثیت سے محترم نہ سمجھتے ہوں۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائرس کے دینی عقائد کے بارے میں ہماری معلومات کیا ہیں؟

تاریخی حیثیت سے یہ قطعی ہے کہ سائرس زردشت کا پیرو تھا۔ جسے یونانیوں نے "زاروست۔ر" کے نام سے پکارا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ غالباً اسی کی شخصیت ہے جو اس نئی دعوت کی تبلیغ و عروج کا ذریعہ ہوئی۔ اس نے فارس اور میڈیا میں نئی شہنشاہی کی بنیاد ہی نہیں رکھی تھی بلکہ قدیم مجوسی دین کی جگہ نئے زردشتی دین کی بھی تخم ریزی کی تھی۔ وہ ایران میں نئی شہنشاہی اور نئے دین دونوں کا بانی تھا۔

زردشت کی ہستی کی طرح اس کے ظہور کا زمانہ اور محل بھی تاریخ کا ایک مختلف فیہ موضوع بن گیا ہے، اور انیسویں صدی کا یورپ ایک زمانہ مختلف نظروں اور قیاسوں کی ردوکد میں بسر ہو چکا ہے بعضوں نے اس تاریخی ہستی سے ہی

تخت نشین ہوگیا۔ دارا نے بغاوت فرو کی گوماتہ کو قتل کیا اور نئی مملکت کو اس کے عروج و کمال تک پہنچا دیا۔ دارا کی تخت نشینی بالاتفاق ۵۲۱ قبل مسیح میں ہوئی ہے پس اس کا عہد سائرس کے انتقال سے آٹھ برس بعد شروع ہوگیا تھا۔

یونانی مورخوں کی شہادت موجود ہے کہ بغاوت میڈیا کے قدیم مذہب کے پیرووں کی بغاوت تھی اور خود دارا اپنے کتبہ بے ستون میں "گوماتہ" کو "موگوش" لکھتا ہے یعنی مجوش اور مجوسی مذہب سے مقصود قدیم مذہب ہے۔ [۱]

تاریخ میں اس کا بھی سراغ ملتا ہے کہ پرانے مذہب کے پیرووں کی سرکشی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ چنانچہ دوسری بغاوت "یراوَرتیش" نامی مجوس نے کی تھی جسے دارا نے ہمدان میں [illegible] "چترتمہ"

---

[۱] موگوش کا لفظ ایک جگہ اوستا میں [illegible] آیا ہے اور یہ بات [illegible] قطعی طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ موگوش سے مقصود میڈیا کے اس مذہب کے پیرو ہیں۔ جو زردشت کے ظہور سے پہلے وہاں رائج تھا۔ چونکہ میڈیا کے باشندے بابل اور شام میں موگوش [illegible] ہو گئے تھے اس [illegible] عربوں میں بھی یہی نام مشہور ہوگیا۔ اور موگوش [illegible] مجوس کی شکل اختیار کر لی۔ پھر تمام ایرانیوں کو مجوس کہنے لگے۔ زردشتی اور غیر زردشتی کا امتیاز باقی نہیں رہا۔ حالانکہ اصلاً مجوسی زردشتیوں کے مخالف تھے۔

لیکن اگر سائرس زردست کا معاصر تھا تو کیا کوئی براہ راست . . .
تاریخی شہادت موجود ہے جس سے اس کا دین زردشتی قبول کرنا ثابت ہو؟
نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ تمام قرائن جمع کئے جائیں جو خود تاریخ کی روشنی نے مہیا
کر دیئے ہیں تو یقیناً ایک بالواسطہ شہادت نمایاں ہو جاتی ہے اور اس میں
کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ سائرس نہ صرف دین زردشتی پر عامل تھا، بلکہ اس
کا پہلا حکمراں داعی تھا، اور اس نے یہ ورثہ اپنے جانشینوں کے لئے چھوڑا جو دو سو
برس تک بلا استثنا دینِ زردشتی پر عامل رہا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ روشنی جن واقعات پر پڑتی ہے، وہ
دو ہیں، اور دونوں کی تاریخی نوعیت مسلم ہے پہلا واقعہ "گوماتہ" کی بغاوت
کا ہے جو سائرس کی وفات کے آٹھ برس بعد ظہور میں آئی۔ دوسرا دارا
کے کتبے ہیں جن سے اس کے دینی عقائد کی نوعیت آشکار ہو گئی ہے۔

سائرس کا بالاتفاق ۵۲۹ قبل مسیح میں انتقال ہوا، اس کے بعد
اس کا بیٹا کم بی سیز (کمبوچیہ یا کیقباد) تخت نشین ہوا۔ اس نے ۵۲۵ ق م
میں مصر فتح کیا۔ لیکن ابھی مصر ہی میں تھا کہ معلوم ہوا، ایران میں بغاوت
ہو گئی ہے اور ایک شخص "گوماتہ" نامی نے اپنے آپ کو سائرس کا دوسرا
لڑکا سمرڈیز (فارسی: بردیہ) مشہور کر دیا ہے جو بہت پہلے مر چکا تھا یا مار
ڈالا گیا تھا۔ یہ خبر سن کر وہ مصر سے لوٹا لیکن ابھی شام ہی میں تھا کہ ۵۲۲
قبل مسیح میں اچانک انتقال کر گیا۔ اب چونکہ سائرس کی براہ راست نسل
سے کوئی شہزادہ موجود نہ تھا۔ اس لئے اس کا عم زاد بھائی دارا جو گشتاسپ

کے تعلقات بھی روز بروز بڑھ رہے تھے۔ تاہم وہ کسی ایسے واقعہ کا ذکر نہیں کرتا۔ پس سائرس کی وفات اور دارا کی تخت نشینی کے درمیان آٹھ برس کی جو مدت گذری ہے ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصہ میں کسی نئی مذہبی دعوت کے ظہور و قبول کا کوئی واقعہ نہیں گزرا۔

اب غور کرو، ان واقعات کا لازمی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اگر سائرس کے بعد کم بی سیز اور دارا نے کوئی نئی دعوت قبول نہیں کی تھی، اور دارا دین زردشتی پر عامل تھا، تو کیا اس سے ثابت نہیں ہو رہا کہ دارا اور کم بی سیز سے پہلے زردشتی دین خاندان میں آ چکا ہے؟ اگر سائرس کی وفات کے چند سال بعد قدیم مذہب کے پیرو اس لئے بغاوت کرتے ہیں کیونکہ ایک نیا مذہب قبول کر لیا گیا ہے، تو کیا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ سائرس نیا مذہب قبول کر چکا تھا، اور تبدیل مذہب کا معاملہ نیا نیا پیش آیا تھا؟ پھر اگر زردشت سائرس کا معاصر تھا، تو کیا یہ اس بات کا مزید ثبوت نہیں ہے کہ سب سے پہلے سائرس ہی نے یہ دعوت قبول کی تھی، اور وہ فارس اور میڈیا کا نیا شہنشاہ بھی تھا۔ اور نئی دعوت کا پہلا حکمران داعی بھی؟

نامی نے جو اوجیل میں نقل ہوا۔

دوسرا واقعہ دارا کے کتبوں سے روشنی میں آیا ہے۔ یہ دنیا کی خوش قسمتی ہے کہ دارا نے بعض کتبے پہاڑوں کی جگہ چٹانوں پر نقش کرائے جنہیں سکندر کا حملہ بھی برباد نہ کر سکا۔ ان میں سب سے اہم کتبہ بہستون کا ہے جس میں دارا نے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنی تخت نشینی کی سرگزشت بلند کی ہے دوسرا اصطخر کا ہے۔

جس میں اپنے تمام ماتحت ممالک کے نام گنوائے ہیں ان دونوں میں وہ بار بار "اہورمزدہ" کا نام لیتا ہے، اور اپنی تمام کامرانیوں کو اس کے فضل و کرم سے منسوب کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اہورمزدہ "زردشت" کی تعلیم کا "اللہ" ہے۔

ان دو واقعوں پر ایک تیسرے واقعہ کا بھی اضافہ کر دینا چاہیے یعنی تاریخ میں کوئی اشارہ اس کا نہیں ملتا کہ [illegible] سیرس نے کوئی نیا دین قبول کیا تھا۔ یا دارا کو کوئی اس طرح کا معاملہ پیش آیا تھا۔ ہیروڈوٹس نے دارا کی وفات کے پچاس ساٹھ برس بعد اپنی تاریخ لکھی ہے[1] یعنی اس کے لیے دارا کے عہد کے واقعات بالکل قریبی زمانے کے واقعات تھے ایشیا میں فارسی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے یونانیوں اور فارسیوں

---

[1] دارا کی وفات بالاتفاق ۴۸۶ قبل مسیح میں ہوئی، اور ہیروڈوٹس ۴۸۴ میں پیدا ہوا تھا یعنی دارا کی وفات سے صرف دو سال بعد۔

ان دونوں شخصیتوں کی معاصرت کے واقعہ میں نہیں مل جاتا ؟
مورخ زینوفن نے سائرس کی ابتدائی زندگی کا افسانہ ہمیں سنایا ہے
اس افسانہ میں ایک پر اسرار شخص کی پرچھائیں صاف نظر آرہی ہے جو دشت و
جبل کے اس پردۂ قدرت کو آنے والے کارناموں کے لئے تیار کر رہا تھا۔ کیا
اس پرچھائیں میں ہم خود زردشت کی مقدس شخصیت کی نمود نہیں دیکھ رہے ہیں ؟
اگر زردشت کا ظہور شمالی مغربی ایران میں ہوا تھا۔ اور اگر سائرس کی ابتدائی گمنامی
کا زمانہ بھی شمالی کوہستانوں میں بسر ہوا، تو کیوں یہ دونوں کڑیاں باہم مل کر
ایک گم شدہ داستان کا سراغ نہ بن جائیں ؟ سائرس کی شخصیت وقت کے
تمام ذہنی اور اخلاقی رجحانات کے برخلاف ایک انقلاب انگیز شخصیت تھی۔
ایسی شخصیت کسی انقلاب انگیز داعی کی دعوت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے اور صاف
نظر آرہا ہے کہ وہ داعی شخصیت زردشت ہی کی تھی۔
بہر حال سائرس نے اپنی ابتدائی گمنامی کے عہد میں نئی دعوت قبول کی ہو
یا تخت نشینی کے بعد لیکن یہ قطعی ہے کہ وہ دین زردشتی میں شامل ہیں۔

زردشت اور سائرس

اتنا ہی نہیں، بلکہ ہم غور کرتے ہیں تو اس زنجیر کی کڑیاں اور آگے تک بڑھتی جاتی ہیں۔ البتہ ہم اسے ایک قیاس سے زیادہ کہنے کی جرأت نہیں کریں گے، اگر سائرس، زردشت کا معاصر تھا، اور سائرس کا ابتدائی زمانہ خاندان سے الگ اور گمنامی میں بسر ہوا، تو کیا اسی زمانہ میں دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کے قریب نہیں پہنچ جاتیں؟ اور کیا ایسا سمجھا نہیں سمجھا جا سکتا کہ اسی زمانہ میں سائرس زردشت کی تعلیم و صحبت سے بہرہ مند ہوا؟ سائرس کی ابتدائی زندگی کی سرگذشت تاریخ کی ایک گم شدہ داستان ہے پھر کیا اس داستان کا سراغ ہمیں

جس طرح روم کی مسیحیت قدیم رومی بت پرستی کے ردِ عمل سے محفوظ نہ رہ سکی، اسی طرح زردشت کی خالص توحید پرستانہ تعلیم بھی قدیم مجوسیت کے ردِ عمل سے بچ نہ سکی۔ خصوصاً ساسانی عہد میں جب وہ دوبارہ مرتب و مدوّن ہوئی تو اصل تعلیم سے بالکل ایک مختلف چیز بن چکی تھی۔

زردشت کے ظہور سے پہلے فارس اور میڈیا کے باشندوں کے عقائد کی بھی نوعیت وہی تھی جو ہند و ایرانی آریائی نسل کی تمام دوسری شاخوں کی رہ چکی ہے۔ ہندوستان کے آریوں کی طرح ایران کے آریوں میں بھی پہلے مظاہر قدرت کی پرستش شروع ہوئی۔ پھر سورج کی عظمت کا تصور پیدا ہوا ——— پھر زمانہ میں آگ نے سورج کا قائم مقامی پیدا کر لی۔ کیونکہ تمام مادی عناصر میں روشنی اور حرارت کا سرچشمہ وہی تھی۔ یونانیوں میں ایسے دیوتاؤں کا تصور پیدا ہوا جن سے اچھائی اور برائی، دونوں ظہور میں آتی تھیں۔ لیکن ایرانیوں کے تصور نے دیوتاؤں کو دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک قوت پاک روحانی ہستیوں کی تھی جو انسان کو زندگی کی تمام خوشیاں بخشتی تھی، دوسری قوت برائی کے عفریتوں کی تھی۔ یہ نوع انسانی کے دشمن تھے۔ روحانی ہستیوں کی نمود روشنی میں ہوتی اور شیطانوں کی تاریکی میں۔ نور و ظلمت کی یہی کشمکش ہے جس سے تمام اچھے برے حوادث ظہور میں آتے ہیں۔ چونکہ روشنی پاک روحانیتوں کی نمود ہے اس لئے ہر طرح کی عبادتیں اور قربانیاں اسی کے لئے ہونی چاہئیں۔ اس روشنی کا مظہر آسمان میں سورج

دینِ زردشتی کی حقیقی تعلیم

لیکن اگر ذوالقرنین دینِ زردشتی پر عمل تھا، اور قرآن ذوالقرنین کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا اثبات کرتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ اسے ملہم من اللہ قرار دیتا ہے، تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زردشت کی تعلیم دینِ حق کی تعلیم تھی؟ یقیناً لازم آتا ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اس لزوم سے بچنے کی ہم کوشش کریں، کیونکہ یہ حقیقت اب پوری طرح روشنی میں آچکی ہے کہ زردشت کی تعلیم سرتاسر خدا پرستی، اور نیک عمل کی تعلیم تھی، اور آتش پرستی اور ثنویت کا اعتقاد اس کا پیدا کیا ہوا اعتقاد نہیں ہے، بلکہ قدیم میدوی مجوسیت کا ردِّ عمل ہے۔

زردشت کی تعلیم کا عملی پہلو سب سے زیادہ اہم ہے یونانیوں کی طرح اس کا اخلاق تصور مذہب سے الگ نہیں تھا بلکہ عین مذہب میں تھا اس نے مذہب کو محض ایک قومی اور ملکی مذہب کی شان نہیں دی بلکہ انفرادی زندگی کا روزانہ دستور العمل بنا دیا۔ نفس کی طہارت اور اعمال کی درستگی اس کی تعلیم کا اصلی محور ہے انسانی زندگی کا ہر خیال، ہر قول ہر فعل ضروری ہے کہ اس معیار پر پورا اترے۔ فکر کی راستی گفتار کی راستی اور کردار کی راستی ....

"پرستاران اہورمزدہ" کے لئے تین اصول بنیادی تھے۔

پروفیسر گرنڈٹ کے لفظوں میں اس کا مذہب حقیقت اور عمل کا مذہب تھا۔ یونانی مذہب کی طرح محض رسموں اور ریتوں کا مذہب نہ تھا اس نے مذہب کو ایرانیوں کی ایک حقیقت بنا دیا۔ اور اخلاق اس مذہب کا مرکزی عنصر تھا۔

اس کی عبادت کا تصور ہر طرح کے اصنامی اثرات سے پاک تھا۔ عبادت ہمیں اس لئے نہیں کرنی چاہئیے کہ خدا کے غضب و انتقام سے بچیں، بلکہ اس لئے کہ برکتیں اور سعادتیں حاصل کریں۔ اگر ہم اہورمزدہ کی عبادت نہیں کریں گے تو وہ ہمیں یونانی اور ہندوستانی دیوتاؤں کی طرح اپنے غضب کا نشانہ نہیں بنائے گا۔ لیکن خود ہم سعادت سے محروم رہ جائیں گے۔

اس کی تعلیم کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو آخرت کی زندگی کا اعتقاد ہے وہ کہتا ہے: انسان کی زندگی صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی اس دنیا میں

اور زمین میں آگ تھی۔

بھلائی برائی کا جس قدر تصور تھا، وہ یونانیوں کی طرح صرف مادّی زندگی کی راحتوں اور محرومیوں ہی میں محدود تھا۔ روحانی زندگی اور اس کی سعادت و شقاوت کا کوئی تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔

آگ کی پرستش کی قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں، اور اس کے خاص پجاریوں کا ایک مقدس گروہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے افراد موگوش کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آگے چل کر اسی لقب نے آتش پرستی کا مفہوم پیدا کر لیا۔

لیکن زردشت نے ان تمام عقائد سے انکار کر دیا، اس نے خدا پرستی روحانی سعادت و شقاوت، اور آخرت کی زندگی کا عقیدہ پیدا کیا اس نے کہا: یہاں نہ تو خیر کی بہت سی روحانی ہستیاں ہیں، نہ شر کے بہت سے عفریت۔ یہاں صرف ایک "اہورمزدہ" کی ہستی ہے جو یگانہ ہے، نور ہے، قدوس ہے، حق ہے، حکیم ہے، قدیر ہے، اور تمام کائنات ہستی کی خالق ہے۔ کوئی ہستی نہیں جو اس کے مثل ہو، یا اس کے ہمتا ہو یا اس کی شریک ہو۔ تم نے جن روحانی قوتوں کو خیر کا خالق سمجھ رکھا ہے، وہ خالق و قادر نہیں ہیں بلکہ "اہورمزدہ" کے پیدا کئے ہوئے "امشس سپند" ہیں یعنی ملائکہ ہیں۔ اور شر کا ذریعہ دیوؤں کی خوفناک قوت نہیں ہے بلکہ "انردہیں" (اہرمن) کی ہستی ہے یعنی شیطان کی ہستی ہے یہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے انسان کو تاریکی کی طرف لے جاتا ہے۔

تاریخیں لکھی ہیں، تو یونانیوں کے حریفانہ جذبات پوری طرح ابھرے ہوئے تھے تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایرانیوں کی اخلاقی فضیلت سے انکار نہیں کر سکتے انہیں ماننا پڑتا ہے کہ "ان میں بعض ایسی عظیم فضیلتیں تھیں جو یونانیوں میں نہیں پائی جاتیں !!

"ہم یہاں پروفیسر گرنڈی کے الفاظ پر اکتفا کریں گے کہ :
"ایرانی سچائی اور دیانت کی ایسی فضیلتیں رکھتے تھے جو اُس عہد کی قوموں میں عام طور پر دکھائی نہیں دیتی !!
ان کی راست بازی ، رحم دلی ، شجاعت اور بلند نظری کا سب اعتراف کرتے ہیں اور یہ یقیناً زردشت کی تعلیم کے لازمی نتائج تھے ۔

گذرتی ہے اس کے بعد بھی ایک زندگی پیش آنے گی۔ اس زندگی میں دو عالم ہونگے
ایک اچھائی اور سعادت کا۔ دوسرا برائی اور شقاوت کا۔ جن لوگوں نے اس
زندگی میں نیک عمل کئے ہیں، وہ پہلے عالم میں جائیں گے۔ جنہوں نے بُرے
عمل کئے ہیں وہ دوسرے عالم میں۔ اور اس کا فیصلہ اس دن ہوگا۔ جسے وہ
"آخری فیصلہ" کا دن قرار دیتا ہے۔

لہٰذا روح کا مسئلہ اس کے مذہب کی بنیادی چیز تھا۔ وہ کہتا ہے۔ انسان
فانی ہے مگر اس کی روح فانی نہیں۔ وہ اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے
اور حسب درجات کے دو عالموں میں سے کسی عالم میں داخل ہو جاتی ہے۔

موجودہ عہد کے تمام محققین تاریخ متفق ہیں کہ زردشت کی تعلیم نے
انسان کے اخلاقی اور فکری ارتقاء میں نہایت مؤثر حصہ لیا ہے۔ اس نے پانچسو
برس قبل مسیح ایرانیوں کو اخلاقی پاکیزگی کی ایک ایسی سطح پر پہنچا دیا تھا۔ جہاں سے
ان کے معاصر یونانیوں اور مصریوں کی زندگی بہت ہی پست دکھائی دیتی ہے
ایک ایسا مذہب جس کی تعلیم کا رخ سرتاسر انفرادی زندگی کی پاکیزگی کی طرف
تھا اور جو اپنے پیروؤں کی اخلاقی روش کے لئے نہایت بلند مطالبے رکھتا تھا،
ضروری تھا کہ اعمال و خصائل کے بہتر سانچے ڈھال دے اور تاریخ شہادت
دے رہی ہے کہ اس نے ڈھال دیئے تھے۔ یہ شہادت کن لوگوں کے قلم سے نکلی
ہے؟ ان لوگوں کے قلم سے جو کسی طرح بھی ایرانیوں کے دوست نہیں سمجھے
جا سکتے پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کا تمام زمانہ ایرانیوں اور یونانیوں کی
مسلسل آویزش کا زمانہ رہا ہے، اور ہیروڈوٹس اور زینوفن نے جیسا

بنایا"

دارا اعلان کرتا ہے کہ:

"اہورموزدہ نے اپنے فضل سے مجھے پادشاہت دی اور اسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن وامان قائم کیا۔ میں اہورموزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے میرے خاندان کو، اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے۔ اے اہورموزدہ! میری دعا قبول کر!"

اے انسان! اہورموزدہ کا تیرے لئے حکم یہ ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر۔ صراط مستقیم کو نہ چھوڑ۔ گناہ سے بچتا رہ۔

یاد رہے کہ دارا سائرس کا معاصر تھا، اور اس کی وفات سے صرف آٹھ برس بعد تخت نشین ہوا۔ پس دارا کی صداؤں میں ہم خود سائرس کی صدائیں سن رہے ہیں۔ اس کا بار بار اپنی کامرانیوں کو اہورموزدہ کے فضل وکرم سے منسوب کرنا ٹھیک ٹھیک ذوالقرنین کے اس طریق خطاب کی تصدیق ہے کہ ہذا رحمۃ من ربی (۹۸)

لیکن چوتھی صدی قبل مسیح کے بعد زردشتی مذہب کا تنزل شروع ہو گیا۔ ایک طرف قدیم مجوسی مذہب نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا دوسری طرف خارجی اثرات بھی کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اشکانین شہنشاہ ہوم کے زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ سائرس اور دارا کے عہد کے زردشتی مذہب نے بالکل ایک دوسری ہی شکل اختیار کر لی ہے۔ چوں سکندر اعظم کی

دارا کے فرامین

دارائے اوّل کا زمانہ اس مذہب کی بلند آہنگی کا شاندار زمانہ ہے
اس کے کتبوں میں ہمیں زردشتی تعلیم کی صدائیں صاف سنائی دے رہی ہیں
اور ان سے ہم حقیقت حال معلوم کر سکتے ہیں۔ استخر کا کتبہ ڈھائی ہزار
برس پیشتر کی یہ منادی آج تک بلند کر رہا ہے:

خدائے بزرگ و برتر اہورمزدہ ہے اسی نے زمین پیدا کی،
اسی نے آسمان بنایا، اسی نے انسان کی سعادت بنائی
اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمراں اور آئین ساز

کے پارسیوں کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے اور جس کے لئے ہم ایک فرنچ
مستشرق آنک تیل کی اولوالعزمیوں اور علمی قربانیوں کے شکرگذار
ہیں۔

فتوحات کا سیلاب اٹھا اور وہ ایران کی دو صد سالہ شہنشاہی ہی نہیں بلکہ اس کا مذہب بھی بہالے گیا۔

ایرانیوں کا قومی افسانہ کہتا ہے کہ زردشت کا مقدس صحیفہ اوستا بارہ ہزار بیلوں کی مدبوغ کھالوں پر آبِ زر سے لکھا ہوا تھا جو سکندر کے حملہ اصطخر میں جل کر راکھ ہو گیا۔ بارہ ہزار بیلوں کی کھال کا قصہ تو محض مبالغہ ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بخت نصر کے حملہ بیت المقدس نے جو سلوک توراۃ کے ساتھ کیا تھا، وہی سکندر کے حملہ ایران نے اوستا کے ساتھ کیا یعنی دوجگہ مذہب کا اصلی نوشتہ مفقود ہو گیا۔

پھر جب پانچ سو برس کے بعد ساسانی دورِ حکومت شروع ہوا تو مذہبِ زردشت کی از سرِ نو تدوین کی گئی، اور جس طرح قیدِ بابل کے بعد عزرا نے نئی توراۃ مرتب کی تھی۔ اسی طرح اردشیر بابکانی نے از سرِ نو اوستا کا نسخہ مرتب کرایا، لیکن اب مذہب کی تمام حقیقی خصوصیات طرح طرح کی تبدیلیوں، تحریفوں اور اضافوں سے یک قلم منسوخ ہو چکی تھیں چنانچہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ ساسانی عہد کا مذہب قدیم مجوسیت زردشتیت اور یونانیت کا ایک مخلوط مرکب ہے، اور اس کا بیرونی رنگ و روغن تو تمام تر مجوسیت ہی نے فراہم کیا ہے ساسانی اوستا کا ایک ناقص اور محرّف ٹکڑا ہے جو ہندوستان

کون ہستی ہے؟ سب سے پہلے یہ صورت بے ستون کے مرقع میں زیر بحث ہوئی
جب ۱۸۴۷ء میں کرنیل رالینسن نے اپنی شرح وحل کے ساتھ اصل مرقع کا
چربہ شائع کیا۔ پھر یہی صورت متعدد نقوش میں ملی مثلاً دارا کی سرکاری
مہر کے مرقع میں، نقش رستم میں جو دراصل دارا کی قبر ہے اصطخر کے محل شاہی
کے دروازہ پر جو غالباً درمیانی دروازہ ہے۔

رالینسن سے پہلے سر رابرٹ کیر پورٹر نے یہ نظریہ قائم کر لیا تھا کہ
یہ کوئی مافوق انسانیت ہستی ہونی چاہئیے جو خود بادشاہ سے بھی اوپر اپنی جگہ
رکھتی ہے۔ رالینسن ایک قدم اور آگے بڑھا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ
اہورمزدہ کی ہستی ہے، یعنی خدا کی۔ چنانچہ اس وقت سے یہ رائے
برابر مقبول ہوتی گئی اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ایرانی اگرچہ بت
پرستی سے مجتنب رہے، لیکن انھوں نے اہورمزدہ کی ہستی کے لئے ایک
مرموز یعنی تشخص کا تصور ضرور قائم کر لیا تھا جو ان تصویروں میں نمایاں
ہے اور یہ مصریوں اور آشوریوں کے مرموز تجسم کا اثر تھا جس سے [illegible] ہو گیا تھا[۵]

---

۵ عام رائے یہی ہو گئی تھی لیکن ایسی صدائیں برابر اٹھتی رہی ہیں جنھیں اس رائے سے اختلاف تھا۔ کرنیل رالینسن کی اشاعت کے چند سال بعد علمائے شرقیہ کے ایک عالم ریونڈ چارلس فارسٹر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ تصویر اس [illegible] کی ہے جس نے مرقع منقش کیا تھا اور جو حلقہ اس کی کمر کے گرد نظر آ رہا ہے [illegible] ٹوکری ہے جس میں بیٹھ کر بلندی پر کام کیا کرتے تھے۔ (دیکھو مصنف مذکور کی کتاب One Primeval Language جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۲۹)

اہورمزدہ کی مزعومہ شبیہہ

اس سلسلے میں ایک بحث طلب سوال اور ہے، اور ضروری سا ہے کہ اس پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ یہ مسلّم ہے کہ پیروان زردشت میں بت پرستی کی کبھی کوئی شکل سر نہ اٹھا سکی۔ قدیم مجوسی مذہب میں کبھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لیکن ایران میں دارا اور اس کے بعد کے عہد کے جو آثار ملے ہیں، ان میں ایک خاص صورت کا نقش پایا جاتا ہے۔ یہ پادشاہ کی تصویر نہیں ہو سکتی کیونکہ پادشاہ کی شخصیت مرقع میں الگ نمایاں ہے۔ اس کا محل ہر جگہ بلندی میں اور سب سے اوپر مرتفع ہوا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ خود پادشاہ سے بھی ایک بلند تر ہستی ہو۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ

کے لئے پیروانِ زردشت کا منتہائے خیال تھا۔

سابقاً اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ اس حلقہ اور پروں میں ایک ماورائے انسانیت ہستی کا تصور مرموز تھا۔ جب بھی یہ اہورمزدہ کی جگہ کیوں ہو، جس کی نسبت زردشت نے تقدیس و علو کا اس درجہ بلند تصور قائم کیا ہے، کیونکہ یہ کسی ایسے انسان کی صورت نہ ہو جو اگرچہ انسان تھا مگر اپنی انسانیت کی رفعت و تقدیس کی وجہ سے ایک غیر معمولی ہستی سمجھا جاتا تھا مثلاً خدا کی ایک فرستادہ ہستی۔

بہرحال اس رخ پر ہم جس قدر بڑھتے ہیں، یہ بات واضح ہوتی جاتی ہے کہ اسے اہورمزدہ کی ہستی سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے یہ یا تو خود زردشت کی تصویر ہے جو ایرانی مذہب کا بانی تھا، یا کی ہے جو اس مذہب کا حکمراں پیغمبر اور ہخامنشی شہنشاہی کا تاجدار تھا۔

چونکہ اس صورت کے بائیں ہاتھ میں ہر جگہ ایک حلقہ دیا ہے اور قدیم تصورات میں حلقہ کی شکل حکومت و مالکیت کی علامت سمجھی جاتی تھی اس لئے زیادہ قرین قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سائرس کی تصویر ہو[1]۔

---

[1] ۱۹۱۳ء میں میں نے اپنا یہ خیال مسٹر اڈورڈ براؤن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی (مصنف لٹریری ہسٹری آف پرشیا) وغیرہ۔

لیکن ۱۹۱۲ عیسوی سے (جب کہ میں نے پہلے پہل ایرانی آثار قدیمہ کا بغور مطالعہ کیا) میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہ قیاس اول دن سے غلط رخ پر چلا ہے اور تمام تاریخی اور عقلی قرائن اس کے خلاف ہیں۔

اولاً تمام تاریخی شہادتیں اور خود پارسیوں کا مسلسل تعامل ثابت کر رہا ہے کہ انھوں نے الوہیت کا تصور کبھی کسی انسانی جسم و صورت میں نہیں کیا، اور کبھی کسی مجسمہ کو تقدیس کی نظر سے نہیں دیکھا۔

ثانیاً اگر ابتداد زمانہ سے یہ چیز پیدا ہو گئی ہو، جب بھی کسی طرح یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ خود دارا کے عہد میں پیدا ہو گئی ہو، جو زردشت کی تعلیم کا ابتدائی عہد تھا اور جب یونانی مورخوں کی شہادت کے مطابق ایرانی یونانی بت پرستی کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔

ثالثاً اس شبیہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو معبودیت والوہیت کی کوئی خاص شان رکھتی ہو۔ ہر جگہ اس کی ایک ہی صورت اور وضع ہے اور وہ ایک معمولی انسان کی ہے جس نے اس زمانے کا عام لباس پہن رکھا ہے۔ وہی لباس جو خود دارا اور اس کے جانشینوں کا تصویروں میں دیکھا گیا ہے۔ صرف اتنی بات اس میں زیادہ ہے کہ ایک حلقہ اس کی کمر سے نیچے چاروں طرف بنا دیا گیا ہے، اور عقب میں ایک ایسا طولانی نقش ہے جس میں لہروں کی سی شان پیدا ہو گئی ہے اس حلقہ اور لہریں کو سورج کی مرموز شکل قرار دیا گیا ہے اگر یہ رائے تسلیم بھی کر لی جائے جب بھی یہ اس کے لئے کافی نہیں کہ محض یہ بت، حلقہ اور مشتبہ لہریں ایک خالق ہستی کے نمود

کیا ذوالقرنین نبی تھا؟

جہاں تک قرآن کی تصریحات کا تعلق ہے ایک اہم سوال اور باقی رہ گیا ہے
قرآن میں ہے: "قلنا یا ذوالقرنین" ہم نے کہا اے ذوالقرنین! اس خطاب
کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین براہِ راست وحی الٰہی
سے مخاطب تھا؟ مفسرین نے اس پر طبع آزمائیاں کی ہیں، اور چونکہ امام رازی کے
مقدونی کو ذوالقرنین بنانا چاہتے ہیں اور وہ بنتا نہیں، اس لئے مجبور ہوئے ہیں
کہ یہاں قلنا کے منطوق پر اس کے منطوق کو ترجیح دیں۔
اس میں شک نہیں کہ قلنا کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بات

(MR. Edward Brown Proff. Cambridge Uni
auther litrary history of Persia.)

کو لکھا تھا۔ انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا تھا۔ اور بہت اصرار کے ساتھ
ما تھا کہ بعض مستشرقین جرمنی سے میں اِس بارے میں مراسلت کروں۔ پھر
پہ دنوں کے بعد انھوں نے لکھا، وہ خود اس بارے میں خط و کتابت کر رہے ہیں
کن اس کے بعد جنگِ عظیم شروع ہو گئی اور میری خط و کتابت کا سلسلہ سنسر
ا سخت گیریوں نے بالکل مسدود کر دیا اور پھر نظر بند ہو گیا، اور جب چھوٹا تو اس
ے چند دنوں بعد اُن کے انتقال کی خبر آ گئی۔

ہیکل تعمیر کروں "۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ "خدا نے مجھے حکم دیا ہے" ٹھیک ٹھیک قالنا یا ذالقرنین کی تصدیق ہے۔ ہم اس سے پہلے اس کی خدا پرستی کے اثبات میں جو کچھ لکھ چکے ہیں اس میں سے ہر بات ٹھیک ٹھیک اس کی نبوت کے ثبوت میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

اب صرف ایک معاملہ کی تشریح باقی رہ گئی ہے یعنی یاجوج اور ماجوج سے کون سی قوم مراد ہے؟ اور جو سد سائرس نے بنائی تھی اس کی تاریخی نوعیت کیا ہے۔؟

خطاب ہو۔ یعنی اس عہد کے کسی پیغمبر کے ذریعہ ذوالقرنین کو مخاطب کیا گیا ہو جیسا کہ "فقلنا اضربوہ ببعضھا" (۲: ۷۳) میں ہے، یا خطاب قولی نہ ہو تکوینی جیسا کہ "قیل یا ارض ابلعی ماءک ویا سماء اقلعی" (۱۱: ۴۴) اور قلنا یا نار کونی بردا وسلاما علی ابراہیم" (۲۱: ۶۹) وغیرہا آیات میں ہے لیکن اس طرح کا مطلب جب ہی قرار دینا چاہیئے کہ اس کے لئے قوی وجوہ موجود ہوں، اور یہاں ایسی وجہ موجود نہیں۔ آیت کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ ذوالقرنین کو اللہ نے براہ راست مخاطب کیا، اور اس پر اللہ کی وحی نازل ہوئی تھی۔ باقی رہی یہ بات کہ یہ وحی نبوت کی وحی تھی یا اُس طرح کی وحی تھی جیسی حضرت موسیٰؑ کی والدہ کی نسبت بیان کی گئی ہے کہ "واوحینا الی موسیٰ ان ارضعیہ"

۲ (۷)

تو صحابہ وسلف سے جو تفسیر منقول ہے وہ یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی تھا متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد حافظ ابن کثیر بھی اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

اور غور کرو، قرآن کا یہ بیان سائرس کی شخصیت پر کس طرح ٹھیک ٹھیک منطبق ہو رہا ہے؟ تاریخ اس کی پیغمبرانہ شخصیت کی شہادت دے رہی ہے، اور عہد عتیق کے انبیاء اسے صریح خدا کا برگزیدہ، اس کا مسیح اور اس کی مرضی پوری کرنے والا کہہ رہے ہیں۔ عزرا نبی کی کتاب میں اس کا جو فرمان تعمیر بیت المقدس کے لئے نقل کیا گیا ہے، اس میں وہ خود اعلان کرتا ہے: "خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہودیا کے ملک میں اس کی عبادت کے لئے ایک

جوج کی طرف اپنا منہ کرکے اس کے برخلاف نبوت کر
جوج کی طرف۔ جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روس مسک
اور توبال کا سردار ہے۔ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ میں
تیرا مخالف ہوں۔ میں تجھے پھرا دوں گا۔ تیرے جبڑوں میں
بنسیاں ماروں گا۔ تیرے سارے لشکر اور گھوڑوں اور سواروں
کو جو جنگی پوشاک پہنے جو پھریاں اور سپر لئے ہوئے ہیں اور سب
شمشیر بکف ہیں، کھینچ نکالوں گا۔ اور میں ان کے ساتھ فارس اور
کوش اور فوط کو بھی کھینچ نکالوں گا جو سپر لئے ہوتے اور خود پہنے
ہوں گے۔ نیز جومر اور شمالی بعید کے اطراف کے باشندگان تجرمہ
اور ان کا سارا لشکر۔"

اس کے بعد دور تک تفصیلات چلی گئی ہیں۔ اور چار باتیں خصوصیت
کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جوج شمال کی طرف سے آئے گا تاکہ لوٹ مار
کرسکے۔ دوسری یہ کہ "ماجوج پر اور اُن پر جو جزیروں میں سکونت رکھتے ہیں،
تباہی آئے گی" تیسری یہ جو لوگ اسرائیل کے شہروں میں بسنے والے ہیں وہ بھی
ماجوج کے مقابلہ میں حصہ لیں گے اور اُن کے بے شمار ہتھیار ان کے ہاتھ
آئیں گے۔ چوتھی یہ کہ ماجوج کی تباہی کا گورستان "مسافروں کی وادی"
میں بنے گا جو "سمندر کے پورب میں ہے" اُن کی لاشیں عرصہ تک وہاں
پڑی رہیں گی۔ لوگ انہیں گاڑتے رہیں گے تاکہ رہگذر صاف ہوجائے
(باب ۳۸: ۳۹)

یاجوج ماجوج

قرآن مجید نے یاجوج اور ماجوج کا دو جگہ ذکر کیا ہے ایک تو یہاں ہے، دوسرا سورہ انبیاء میں ہے: "حتیٰ اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون" (۲۱: ۹۶)

یاجوج اور ماجوج کا نام سب سے پہلے عہد عتیق میں آیا ہے حزقیل نبی کی کتاب میں جنہیں بخت نصر اپنے آخری حملہ بیت المقدس میں گرفتار کرکے بابل لے گیا تھا، اور جو سائرس کے ظہور تک زندہ رہے یہ پیشین گوئی ملتی ہے:۔

"اور خداوند کا کلام مجھ تک پہنچا۔ اس نے کہا اے آدم زاد تو

گاگ اور مے گاگ

یاجوج اور ماجوج کے لئے یورپ کی زبانوں میں Gog اور
ر Magog) کے نام مشہور ہیں۔ اور شارحین تورات کہتے ہیں کہ یہ نام
سب سے پہلے تورات کے ترجمہ سبعینی[1] میں اختیار کئے گئے تھے لیکن کیا اس
لئے کئے گئے تھے کہ جوج اور ماجوج کا یونانی تلفظ یہی ہو سکتا تھا جو

---

[1] ترجمہ سبعینی سے مقصود تورات کا وہ پہلا یونانی ترجمہ ہے جو اسکندریہ میں
شاہی حکم سے ہوا تھا۔ اور جس میں ستر علمائے یہود شریک تھے۔

یہ واضح رہے کہ اس پیشین گوئی سے پہلے سائرس کے ظہور اور یہودیوں کی آزادی و خوشحالی کی پیشین گوئی بیان کی جا چکی ہے اور اس پیشین گوئی کا محل ٹھیک اس مکاشفہ کے بعد ہے۔ جس میں حزقئیل نبی نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہڈیوں کو زندہ ہوتے دیکھا تھا، اور جیسے قرآن نے بھی سورۃ بقر کی آیت "او کالذی مر علیٰ قریۃ وھی خاویۃ علیٰ عروشھا" (۲:۲۵۹) میں بیان کیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ جوج اور ماجوج کا معاملہ بھی اسی زمانہ کے لگ بھگ پیش آنے والا ہو۔ یعنی سائرس کے زمانہ میں، اور یہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا ایک مزید ثبوت ہے کیونکہ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ اسی نے یاجوج وماجوج کے حملوں کی روک تھام کے لئے ایک سد تعمیر کی تھی۔

عہد عتیق کے بعد یہ نام ہمیں مکاشفات یوحنا میں بھی ملتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا، اور وہ ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہوں گی یعنی یاجوج وماجوج کو گمراہ کرنے اور لڑائی کے لئے جمع کرنے نکلے گا۔ ان کا شمار سمندر کی ریت کے برابر ہوگا وہ تمام زمین کی وسعتوں پر چڑھ جائے گی!"

(۲۰:۷)

شمال مشرق کے اس علاقہ کا بڑا حصہ اب "منگولیا" کہلاتا ہے۔ لیکن "منگول" لفظ کی ابتدائی شکل کیا تھی؟ اس کے بعد جب ہم چین کے تاریخی مسائل کی طرف رجوع کرتے ہیں (اور ہمیں اسی طرف رجوع ہونا چاہئے کیونکہ وہ منگولیا کے ہمسایہ میں ہے) تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم نام "موگ" تھا یعنی نام ہوا "موگ" ہے جو چھ سو برس قبل مسیح یونانیوں میں "میگ" اور "مے گاگ" پکارا جاتا ہوگا اور یہی عبرانی میں "ماجوج" ہوگیا۔

چین کی تاریخ میں ہمیں اس علاقہ کے ایک اور قبیلہ کا ذکر بھی ملتا ہے جو "یواچی" کے نام سے پکارا جاتا تھا یہی "یواچی" ہے جنہوں نے مختلف

یا خود یونانی میں پہلے سے یہ نام موجود تھے؟ اس بارے میں شارحین کی رائیں مختلف ہیں لیکن زیادہ قوی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں نام اسی طرح یا اس کے قریب قریب یونانیوں میں بھی مشہور تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کون قوم تھی؟ تمام تاریخی قرائن متفق طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سے مقصود صرف ایک ہی قوم ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں یعنی شمال مشرقی میدانوں کے وہ وحشی مگر طاقتور قبائل جن کا سیلاب قبل از تاریخ عہد سے لے کر نویں صدی مسیحی تک برابر مغرب کی طرف امنڈتا رہا، جن کے مشرقی حملوں کی روک تھام کے لئے چینیوں کو سینکڑوں میل لمبی دیوار بنانی پڑی تھی، جن کی مختلف شاخیں تاریخ میں مختلف ناموں سے پکاری گئی ہیں اور جن کا آخری قبیلہ یورپ میں میگو کے نام سے روشناس ہوا اور ایشیا میں تاتاریوں کے نام سے۔ اسی قوم کی ایک شاخ تھی جسے یونانیوں نے سیتھین کے نام سے پکارا ہے اور اسی کے حملوں کی روک تھام کے لیے سائرس نے سد تعمیر کی تھی۔

یہ علاقہ صدیوں تک اپنی اصلی وحشیانہ حالت پہ باقی رہا لیکن جو قبائل یہاں سے نکل نکل کر مختلف ملکوں میں بستے گئے۔ انہوں نے مقامی خصوصیت اختیار کر کے تہذیب و تمدن کی طرف بڑھنا شروع کر دیا یہاں تک کہ چند صدیوں کے بعد ان کی حالت اس درجہ مختلف ہوگئی کہ ان میں اور ان کے قدیم ہم وطنوں میں کوئی بات بھی مشترک باقی نہیں رہی۔ وہ اب مہذب ہو رہے تھے۔ یہ بدستور وحشی تھے۔ وہ تہذیب کے صناعی ہتھیاروں سے لڑتے تھے، یہ وحشت کی قدرتی طبعیت اور درندگی سے۔ ان میں مداخلت صناعت اور ذہنی ترقی کی مختلف شاخیں ابھر رہی تھیں۔ وہ ان سب سے ناآشنا تھے سرد علاقہ کی صحرائی زندگی اور وحشیانہ خصائل کی خشونت نے انہیں وقت کی شائستہ اقوام کے لئے ایک خوفناک ہستی بنا دیا تھا۔

قبل اس کے کہ تاریخی عہد کی صبح طلوع ہو، شمالی مغربی قبائل کی مہاجرت شروع ہو چکی تھی اور اس کا سلسلہ تاریخی عہد میں بھی بدستور جاری رہا۔

ان ہی قبائل کا ایک ابتدائی گروہ وہ تھا جو آریائی نسل کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ وسط ایشیا سے یورپ کی طرف بڑھا ایک نیچے اتر کر پنجاب میں آباد ہوگیا۔ ایک مغرب کی طرف بڑھا اور فارس اور میڈیا اور اناطولیا میں بس گیا۔ اسے ایک انڈو یورپین آریا

قوموں کے مخارج و تلفظ سے گزر کر کوئی ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ عبرانی میں "یاجوج" ہو گیا۔

اس امر کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ان نتائج پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے جو مختلف قوموں کے نسلی جغرافیائی اور لغوی علائق کی بحث و تنقید سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور جو موجودہ زمانے میں تاریخ اقوام کے طے شدہ مبادیات ہیں۔

کرۂ ارضی کی بلند سطح کا وہ حصہ جو شمال مشرق میں واقع ہے اور جسے آج کل منگولیا اور چینی ترکستان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ تاریخ قدیم کی بیشمار قوموں کا ابتدائی گہوارہ رہ چکا ہے۔ یہ نسل انسانی کا ایک ایسا سرچشمہ تھا جہاں پانی برابر اُبلتا اور جمع ہوتا رہتا، اور جب بہت بڑھ جاتا تو مشرق اور مغرب کی طرف اُمنڈنا چاہتا۔ اس کے مشرق میں چین تھا، مغرب و شمال میں پانی پھیلا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے قوموں اور قبیلوں کے سیلاب امنڈتے رہتے۔ کچھ وسط ایشیا میں آباد ہو گئے کچھ آگے بڑھے اور شمالی یورپ تک پہنچ گئے۔ کچھ وسط ایشیا سے نیچے اتر گئے اور جنوبی و مغربی ایشیا پر قابض ہو گئے۔ یہ قبائل جو اس علاقے سے نکلتے تھے، مختلف ملکوں میں بس کر وہاں کی خصوصیات اختیار کر لیتے تھے اور رفتہ رفتہ ایک مقامی قوم بن جاتے تھے، لیکن ان کا روشنی سرچشمہ اپنی اصلی حالت پر باقی رہتا یہاں تک کہ پھر قبائل کا ایک نیا سیلاب اٹھتا اور کسی نئے علاقے میں پہنچ کر ایک نئی مقامی قومیت کی تخلیق کر دیتا۔

موزوں تھا، اس لئے بہت جلد انہوں نے زراعتی زندگی اختیار کر لی اور پھر تہذیب و حضارت کی طرف بڑھنے لگیں۔ لیکن جو شاخیں یورپ کی طرف بڑھیں، انہیں ایسا ماحول میسر نہیں آیا۔ اس لئے صحرائی زندگی کی تمام خصوصیات ان میں بدستور باقی رہیں اور صدیوں تک متغیر نہ ہو سکیں۔

اب گویا ان قبائل کی تین حالتیں ہو گئی تھیں۔

اولاً منگولیا کے اصلی باشندے جو یک قلم وحشی اور صحرائی تھے اور ان کی یہ حالت بغیر کسی تغیر کے برابر قائم رہی۔

ثانیاً، بحر اسود کے شمالی ساحل اور شمالی یورپ کے قبائل جو گو اپنے مولد اصلی سے الگ ہو گئے تھے، لیکن ان کی وحشیانہ خصوصیات نہیں بدلی تھیں۔

ثالثاً ہندوستان، ایران اور اناتولیا کے قبائل جو بتدریج شہریت و حضارت میں ترقی کرنے لگے، اور پھر آگے چل کر تین قدیم تمدنوں کے بانی ہوئے۔

کے نام سے شناخت کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان اور یورپ، دونوں کی آریائی اقوام کے مورث اعلیٰ تھے۔ ان کا جو حصہ شمالی ہند میں بس گیا تھا، اُس کے اپنا نسلی خطاب برابر یاد رکھا اور اپنے آپ کو آریا ورتھ کہتا رہا۔ جو فارس اور میڈیا میں بسا اس نے اپنی ابتدائی قیام گاہ کو ایریانہ کے نام سے موسوم کیا (جیسے اوستا میں ایریانہ دیگو کہا گیا ہے) اور یہی ایریانہ ایران ہو گیا۔ جو قبائل اناتولیا تک پہنچ گئے تھے۔ وہ غالباً "ہیتی" کے نام سے پکارے گئے، جنہیں تورات کی کتاب پیدائش میں "حتی" کہا گیا ہے، اور مصر کے قدیم نوشتوں میں "ختتی" پایا جاتا ہے۔

جو قبائل یورپ میں پہنچے؛ وہ گوتھ، فرانک، الامان، ونڈال، ٹیوٹان اور ونہا کے نام سے مشہور ہوئے، اور ان ہی کی ایک وسیع شاخ وہ تھی جو بحر اسود سے لے کر دریائے ڈینیوب کی بالائی وادی تک پھیل گئی اور سیتھین کے نام سے پکاری گئی۔ وسط ایشیا کے مشرقی قبائل بھی جو بکٹریا (بلخ) پر تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے۔ سیتھیں ہی تسلیم کئے گئے ہیں اور خود دارا نے اپنے کتبہ استخر میں انہیں اسی نام سے پکارا ہے۔

ان قبائل کی جو تین شاخیں۔ شمالی ہند، اناتولیا (ایشیائے کوچک) اور ایران میں بس گئی تھیں، انہیں ایسا ماحول ملا جو زراعت کے لئے

سکونت اختیار کر کے تہذیب و حضارت کی طرف بڑھنے لگے تو قوموں
کے حافظہ سے ان کا نام بھی اتر گیا۔ اور یاجوج ماجوج کا اطلاق صرف
اسی خطہ میں سمٹ آیا۔ جہاں سے پھیلنا شروع ہوا تھا۔ یعنی صرف
منگولیا کے صحرا نورد قبائل ہی یاجوج و ماجوج سمجھے جانے لگے۔ چنانچہ
قرآن نے سورۂ انبیاء میں ان کے جس خروج کی خبر دی ہے۔ وہ منگولیا کے
تاتاریوں کا آخری خروج تھا۔

یورپ کی تمام موجودہ قومیں (لاطینی نسل مستثنیٰ کر دینے کے بعد)
براہ راست ان ہی قبائل کی نسل سے ہیں جیسا کہ معلوم و مسلم ہے۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ نسل انسانی نے اکثر حالتوں
میں پہلے صحرا نوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی ہے۔ پھر توطن اور
اقامت گزینی اختیار کی ہے اور اس اختلاف حالت نے ہمیشہ دو طرح
کے انسانی گروہوں سے دنیا کو آباد رکھا ہے۔ صحرا نورد قبائل کے گروہ
اور اقامت گزین قبائل کے گروہ۔ معیشت کی یہ دونوں حالتیں اس درجہ
مختلف تھیں کہ ایک ہی نسل کے دو قبیلوں میں سے ایک قبیلہ اگر صحرا نورد
رہتا تھا اور دوسرا اقامت گزین ہو جاتا تھا تو چند صدیوں کے بعد نہ
صرف ایک دوسرے سے اجنبی ہو جاتے تھے بلکہ بالکل متضاد قسم کی مخلوق
بن جاتے تھے صحرا نورد قبائل کو غذا کے لئے جانوروں کے دودھ اور
شکار کے گوشت پر اعتماد کرنا پڑتا تھا۔ اقامت گزین قبائل کو اناج پر۔
وہ گھوڑوں کی برہنہ پیٹھ پر زندگی بسر کرتے۔ یہ کھیتوں میں اور مکانوں کی

یاجوج ماجوج کا اطلاق

تقریباً ... ء قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی مسیحی تک یاجوج اور
ماجوج یا گوگ اور ماگوگ کا اطلاق پہلی دو قسموں پر ہوتا رہا۔ پہلی
پر اس لئے کہ قومیت اور مقام کے لحاظ سے وہی یاجوج ماجوج تھی دوسری
پر اس لئے کہ گو اپنے مولد و مقام سے الگ ہو چکی تھی لیکن ابھی انہیں وحشیانہ
خصوصیات میں بالکل متغیر نہیں ہوتی تھی تیسری قسم چونکہ یکسر منقلب
ہو چکی تھی اس لئے اب وہ یاجوج و ماجوج نہیں رہی تھی بلکہ خود یاجوج
ماجوج کی غارت گریوں کا نشانہ بن گئی تھی۔ البتہ جب پانچویں صدی
مسیحی میں پہلی دو قسم کے قبائل کی حالت بھی منقلب ہونا شروع ہو گئی اور

متحد کر کے ایک فوج کی نوعیت دے دیتا تو پھر قتل و غارت گری کی ایک ایسی منظم طاقت پیدا ہو جاتی جو صرف وقتی حملوں ہی پر قانع نہیں رہتی بلکہ مملکتوں اور قوموں پر قابض ہو جاتی اور شہری آبادیوں کی بڑی سے بڑی قوتیں بھی اس کی راہ نہیں روک سکتیں!

تاریخ شاہد ہے کہ صحرا نورد اور غیر متمدن اقوام کے مقابلہ میں شہری اور متمدن اقوام کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا یہاں تک کہ علم و صناعت نے ایسے ہتھیار اور جنگی وسائل پیدا کر دیئے جن کے مقابلہ سے غیر متمدن اقوام عاجز آ گئیں۔

چنانچہ ان شمالی مشرقی قبائل کی پوری تاریخ اسی حقیقت کا افسانہ ہے ان کی جن شاخوں نے اقامت گزینی کی زندگی اختیار کر لی تھی، وہ بالکل ایک دوسری قوم بن گئیں، اور جنہیں ایسے حالات میسر نہیں آئے وہ بدستور صحرانورد ہیں۔ اقامت گزین قبائل کے لئے صحرانورد قبائل صرف اجنبی ہی نہیں ہو گئے تھے، بلکہ خوفناک بھی ہو گئے تھے، کیونکہ ان کی روز افزوں شہریت ان کی صحرائی وحشت ناکیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ جب کبھی موقعہ پاتے، قرب و جوار کی آبادیاں غارت کرتے، اور اگر قبائل کا کوئی قائد نکل آتا تو ان کی غارت گریاں دور دور تک بھی پہنچ جاتیں صدیوں تک ان کی حالت ایسی ہی رہی۔ پھر جب چوتھی صدی مسیحی سے ان کے ان اندر ایسے قائد پیدا ہونے لگے۔ جنہوں نے نظم و اطاعت کا راز پا لیا تھا تو یکایک ان کی طاقت کا ایک نیا دور شروع ہو گیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پانچویں صدی میں "اٹیلا" نے جو ہُن قبیلہ کا قائد تھا، ایک

چار دیواری میں۔ ان کی زندگی کا ماحول صحرائیت تھی۔ ان کا ماحول شہریت
ان کو نشو و نما کے لیے جنگ کی ضرورت تھی، ان کو امن کی۔ ان کا جسم روز
بروز طاقتور اور محنت پسند ہوتا جاتا تھا، ان کا روز بروز کمزور اور راحت
پسند۔ وہ روز بروز وحشت و خونخواری میں بڑھتے جاتے تھے، یہ روز بروز تہذیب
و نضارت میں، تہذیب و حضارت کا لازمی نتیجہ تھا کہ جذبات و خصائل میں
لطافت اور نرمی پیدا ہو، صحرائیت و خانہ بدوشی کا لازمی نتیجہ تھا کہ جذبات
اور خصائل میں وحشت و خشونت ہو۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ جوں جوں اقامت
گزین قبائل شائستہ ہوتے ہو جاتے، صحرانورد قبائل کی ہستی ان کے لیے ہولناک
اور ناقابل مزاحمت ہوتی جاتی۔ جب کبھی دونوں میں مقابلہ ہوتی تو شہری قبائل
دیکھتے کہ صحرانورد قبائل عفریتوں کی طرح خوفناک اور درندوں کی طرح خونخوار
ہیں۔ اور صحرانورد قبائل معلوم کر لیتے کہ ان کی غارت گریوں کے لیے شہری آبادیاں
سے زیادہ کوئی سہل شکار نہیں۔

البتہ صحرانورد قبائل متفرق تھے، اور اقامت گزینی کے طریقوں سے
ناآشنا۔ اقامت گزین قبائل باہم مربوط تھے اور معیشت کے منظم طریقوں
سے آشنا۔ اس لیے قدرتی طور پر صحرانوردوں کے حملے ایک خاص حد سے
آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ وہ خوفناک درندوں کی طرح آبادیوں
پر گرتے اور قتل و غارت کرکے نکل جاتے لیکن جم کر ٹک نہیں سکتے تھے
اور نہ علاقے فتح کرکے اپنے قبضے میں رکھ سکتے تھے۔ مگر جب کبھی صدیوں
کے بعد ان میں کوئی حکمران قائد پیدا ہو جاتا اور وہ بہت سے قبیلوں کو

(۲) دوسرا دور صبح تاریخ کا ہے، لیکن روشنی ابھی دھندلی ہے اب اقامت گزینی اور صحرانوردی کی دو مختلف اور متوازی معیشتوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے، شمالی ہند، ایران اور اناتولیا کے قبائل اقامت گزینی کی زندگی میں بدل چکے ہیں۔ مگر وسط ایشیا سے لے کر بحر اسود تک صحرا نورد قبائل کے جتھے پھیلتے جاتے ہیں اور مشرق سے نئے نئے قبیلوں کے اقدام کا سلسلہ برابر جاری ہے یہ زمانہ تقریباً ۔۔۔ ۳ قبل مسیح سے ۔۔ ۱۵ قبل مسیح تک کا تصور کرنا چاہیئے [1]

(۳) تیسرا دور تاریخ کی روشنی میں پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ اب بحر خزر، اور بحر اسود کا علاقہ ایک

---

[1] یہ سن تعین اسی طرح کے تمام تعینات کی طرح محض تاریخی قیاسات پر مبنی ہے، اور اسی لیئے اس بارے میں نظار تاریخ کی آرائیں مختلف ہوئیں۔ البتہ حال کے انکشافات سے ایک بات تقریباً پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے یعنی اڑھائی ہزار سال قبل مسیح اناتولیا میں "حتی" یا "حتی" تمدن شروع ہو چکا تھا۔ اور قدیم مصری تمدن کا معاصر تھا۔ "بوغاز کوئی" میں حتی کتب خانہ برآمد ہوا ہے اور جس میں بیس ہزار کے قریب منقوش تختیاں نکلی ہیں۔ اس نے انیس ویں صدی کے تاریخی تخمینے بہت کچھ بدل دیئے ہیں، اور اب یہ رجحان کہ اس زمانے کی مدت گھٹائی جائے تقریباً مفقود ہو رہا ہے۔

عظیم فاتح کی حیثیت اختیار کر لی اور رومن امپائر کی دونوں مشرقی و مغربی مملکتوں کو لرزہ بر اندام کر دیا۔ پھر یہی قبائل ہیں جو بالآخر اس طرح تمام یورپ پر چھا گئے کہ نہ صرف رومن امپائر کو بلکہ رومی تمدّن کو ہمیشہ کے لئے پامال کر دیا۔

چند صدیوں کے بعد تاریخ یہ منظر پھر دہراتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خود منگولیا میں ایک نیا منگولی قائد چنگیز خاں پیدا ہو گیا ہے وہ تمام تاتاری قبائل کو اپنے ماتحت ایک قوم بنا دیتا ہے، اور پھر فتح و تسخیر کا ایک ایسا ہولناک سیلاب اُمنڈ آتا ہے جسے اسلامی ممالک کی کوئی متمدن قوت بھی نہ روک سکی۔ وسطِ ایشیا سے لے کر عراق تک جو ملک اس کے سامنے آیا خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج ماجوج سے مقصود یہی منگولین قوم اور اس کی تمام صحرانورد اور وحشی شاخیں ہیں۔ اب ہم چاہتے ہیں ان کے خروج و ظہور کے مختلف دور تاریخی ترتیب سے منضبط کر لیں اسی ضمن میں یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ سائرس کے زمانے میں یہ قوم کہاں تھی، اور کیوں اسے سد تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آئی؟

اس بارے میں تاریخ کی شہادتوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) پہلا دور تاریخی عہد سے پہلے کا ہے جب شمال مشرق سے ان قبائل کے ابتدائی گروہ نکلے اور وسط ایشیا میں آباد ہو گئے یہ پھر جنوب اور مغرب میں پھیلنے لگے۔ اس خروج و انشعاب کی رفتار بہت سست رہی ہو گی اور بے شمار منزلیں پیش آئی ہوں گی۔

ملتا ہے، جب وہ فتح بابل سے پہلے "سیتھین" قبائل کے سرحدی حملوں کا تدارک کرتا ہے۔ دوسرا دارا کے زمانے میں جب وہ باسفورس عبور کر کے دریائے ڈینوب کی وادیوں میں پہنچ جاتا ہے اور ان قبائل کو دور تک بھگا دیتا ہے۔

دارا کے حملے کے بعد ان کا دباؤ شمالی یورپ کی طرف بڑھنے لگا۔

(۵) پانچواں دور تیسری صدی قبل مسیح کا ہے۔ اس عہد میں منگولین قبائل کا ایک نیا سیلاب اٹھتا ہے اور پہلے چین کی آبادیوں پر ٹوٹتا ہے پھر آہستہ آہستہ وسط ایشیا کی قدیم شاہراہ اختیار کرتا ہے۔ چین کی تاریخ میں انہیں "ہیونگ نہ" کے نام سے پکارا گیا ہے اور یہی نام آگے چل کر "ہن" ہو گیا ہے۔

یہی زمانہ ہے جب شہنشاہ چین شین ہوانگ ٹی نے ان حملوں کے روکنے کے لئے وہ عظیم الشان دیوار تعمیر کی جو دیوار چین کے نام سے مشہور ہے اور پندرہ سو میل تک چلی گئی ہے۔ اس کی تعمیر ۲۱۴ قبل مسیح میں شروع ہوئی اور بیان کیا جاتا ہے کہ دس برس میں ختم ہوئی اس نے شمال اور مغرب کی طرف سے منگولین قبائل کے حملوں کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔ اس لئے ان کا رخ پھر وسط ایشیا کی طرف مڑ گیا۔

(۶) چھٹا دور تیسری صدی مسیحی کا ہے جب ان قبائل نے یورپ میں ایک نئی کروٹ لی۔ اور بالآخر رومی مملکت اور رومی تمدن کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

(۷) ساتواں اور آخری دور بارھویں صدی مسیحی اور چھٹی صدی ہجری کا ہے۔

وحشی اور خونخوار قوم کا مرکز بن چکا ہے اور وہ مختلف ناموں میں مختلف جہتوں سے نمایاں ہوتی رہتی ہے پھر اچانک تاریخ کے افق پر "سیتھین" قوم کا نام ابھرتا ہے۔ یہ وسط ایشیا سے لے کر بحر اسود کے شمالی کناروں تک آباد ہے۔ اور اطراف و جوانب میں برابر حملہ آور ہوتی رہتی ہے یہ زمانہ آشوری تمدن کے ظہور۔ اور بابل اور نینوا کے عروج کا تھا اور ہیرودوٹس کی زبانی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آشوریوں کی شمالی سرحد پر سیتھین قبائل کی غارت گریاں برابر جاری رہیں یہ شمالی سرحد بحر خزر کے جنوبی ساحل اور آرمینیا کے سلسلۂ کوہ تک پہنچی ہوئی تھی اور وہ کاکیشیا کے درے سے اتر کر آشوری آبادیوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ پھر ۶۳۰ قبل مسیح میں اچانک ان کا ایک عظیم گروہ اسی راہ سے اترتا ہے اور ایران کا تمام مغربی حصہ پامال کر دیتا ہے۔ یونانی مورخوں کا کہنا ہے کہ آشوری مملکت کی تباہی کا ایک بڑا باعث یہی غارت گری تھی [1]

(۴) چوتھا دور ۵۵۰ قبل مسیح کا قرار دینا چاہیئے، جب سائرس کا ظہور ہوا اور فارس اور میڈیا کی متحدہ شہنشاہی کی بنیاد پڑی۔ اس عہد میں مغربی ایشیا کا تمام علاقہ سیتھین حملوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور صدیوں تک ان کے حملوں کی کوئی صدا تاریخ کی سماعت تک نہیں پہنچتی۔ اس عہد میں صرف دو موقعوں پر ان کا ذکر آتا ہے۔ پہلا سائرس کے زمانے

---

[1] ہیرودوٹس ۱-۱۰۴۔

"مسک اور توبال کا سردار کہا ہے، اور یہ ٹھیک ٹھیک الناہی قبائل کے نام ہیں۔ "روش" وہی ہے جس سے "رشیا" نکلا "مسک" وہی ہے جو "موسکو" ہوا۔ اور "توبال" بحر اسود کا بالائی علاقہ تھا۔

پھر کہا ہے کہ "میں تجھے پھر پھرا دوں گا" اور "تیرے جبڑوں میں بنسیاں لٹاؤں گا"

یہ رہی واقعہ ہے کہ سائرس نے سیتھین قبائل کے منہ پھرا دیئے اور سد تعمیر کر کے اُن پر اُن کی راہ روک دی۔ پھر کہا ہے "ایسا معاملہ واقع ہوگا کہ ان کے تمام ہتھیار جلا دیئے جائیں گے" اور ریگزاروں کی ایک وادی میں جو سمندر کے پورب میں ہے۔ ان قوموں کا گورستان بنے گا نیز عرصہ تک لوگ لاشیں گاڑتے رہیں گے تاکہ راہ صاف کریں" یہ وہ واقعہ ہے جو دارا کے حملۂ یورپ میں پیش آیا۔ دارا کی فوج مملکت کی تمام اقوام سے مرکب تھی اس میں یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی وہ باسفورس عبور کر کے مشرقی یورپ پہنچ گیا تھا۔ اور اگرچہ یونانیوں کی بے وفائی کی وجہ سے اسے واپس ہونا پڑا، لیکن اس لشکر کشی میں بے شمار سیتھین مارے گئے اور ان کی قوت عرصہ تک کے لئے مضمحل ہوگئی۔

باقی رہی وہ پیشین گوئی جو مکاشفات یوحنا میں ملتی ہے تو مکاشفات کے اکثر مقامات کی طرح اس مقام کی بھی کوئی جمتی ہوئی تفسیر شارحین انجیل نہ کر سکے۔ اس میں ایک ہزار برس کی مدت تبلائی گئی ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے

جب منگولیا میں تازہ دم قبائل کی ایک بڑی تعداد پھر تیار ہو گئی، اور چنگیز خاں نے انہیں متحد کر کے ایک نئی فتح مند طاقت پیدا کر دی۔

مندرجہ صدر خلاصہ سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں مغربی ایشیا کا تمام علاقہ سیتھین قبائل کے حملوں سے غارت ہو رہا تھا اور جس ہاتھ نے اچانک ظاہر ہو کر ان کے حملے روک دیئے اور پھر ہمیشہ کے لیئے مغربی ایشیا یک قلم محفوظ ہو گیا، وہ سائرس کا ہاتھ۔ پس یقیناً منگولین نسل کے لئے یہی سیتھین قبائل تھے جو یاجوج وماجوج کے نام سے پکارے جاتے تھے، اور ذوالقرنین یعنی سائرس نے انہی کی راہ روکنے کے لیئے سد تعمیر کی۔ جس طرح تین صدیوں کے بعد چینی مجبور ہوئے کہ انہیں روکنے کے لئے ایک دیوار تعمیر کریں۔

اب غور کرو سیتھین قبائل کے یہ حملے کس جانب سے ہوتے تھے؟ ہیروڈوٹس وغیرہ یونانی مورخ بتلاتے ہیں کہ صرف ایک راہ سے یعنی کاکیشیا کے درّہ سے یہی مقام صدیوں تک دونوں علاقوں میں درمیان کا پھاٹک رہا ہے۔

اب اگر سائرس ان حملوں سے محفوظ ہونا چاہتا تھا تو کیا اس کے لئے ضروری نہ تھا کہ یہ پھاٹک بند کر دے؟ قدرتی طور پر ضروری تھا اور اس لئے اس نے سد تعمیر کر کے یہ راہ مسدود کر دی چونکہ ان حملوں کی صرف یہی ایک راہ تھی اور وہ اس طرح بند کر دی گئی، اس لئے یاجوجی حملوں کا بھی یک قلم خاتمہ ہو گیا۔

اب پھر حزقیل نبی کی پیشین گوئی پر ایک نظر ڈالو۔ اس میں جوج کو روش،

پر مطمئن رہی اور عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ تمام قومیں صرف نوح علیہ السلام کے تین لڑکوں ہی سے پیدا ہوئی ہے۔

لیکن اب اس کی علمی قدر و قیمت یک قلم مشتبہ ہو گئی ہے اور اسے کوئی بھی اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے ایک تاریخی بیان کو دیکھا چاہئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک ایسا نوشتہ ہے جس میں ہمیں ۵۰۰ سال قبل مسیح کے یہودی تصورات نظر آجاتے ہیں۔ بلا شبہ ان میں ایک عنصر ان مقدس روایتوں کا بھی ہے جو قومی حافظہ نے محفوظ رکھی تھیں لیکن ساتھ ہی بابلی اور آشوری روایتوں کا بھی ایک عنصر شامل ہو گیا ہے جو قیام بابل کی طویل مدت کا قدرتی نتیجہ تھا۔

کہ اس مدت سے مقصود کون سی مدت ہے اور کب سے شروع ہوتی ہے؟
اگر حضرت مسیح سے شروع ہوتی ہو، تو ظاہر ہے کہ دسویں صدی مسیحی میں کوئی ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ ہزار برس سے مقصود وہ مدت ہو جو سقوط بابل سے شروع ہوتی ہے کیوں کہ اس معاملہ سے پہلے بابل کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے اگر ایسا ہی ہے تو پھر ایک بات بن سکتی ہے۔
بابل کا سقوط چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوا ہے اور چوتھی صدی مسیحی میں یورپ پر منگولین قبائل نے رومی مملکت پر حملے شروع کر دیئے تھے۔
پس یاجوج وماجوج کا یہ خروج سقوط بابل کے ہزار برس بعد ضرور ہوا ہے۔
"ماجوج" کا ذکر تورات کی کتاب پیدائش میں بھی آیا ہے۔ جہاں حضرت نوح کے تین لڑکوں سام۔ حام اور یافث سے اقوام عالم کا پیدا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ یافث کی نسبت لکھا ہے کہ اس سے:
"جمر، ماجوج، مادی، یونان، توبان، مسک اور تیراس پیدا ہوئے"
(۱۰: ۲)

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج سے مقصود منگولین نسل ہے کیوں کہ قدیم مورخوں نے اسی تصریح کی بنا پر انہیں یافثی نسل قرار دیا ہے علاوہ بریں اگر یہ صحیح ہے کہ کتاب پیدائش کا مواد قید بابل کے زمانہ میں تیار ہوا ہے، تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ماجوج اور مادیون کو ہم نسل سمجھا جاتا تھا۔
یہ یاد رہے کہ اگرچہ دنیا عرصہ تک کتاب پیدائش کے اس بیان پر

گئی ہے جہاں کا کیشیا کا مشرقی حصہ بہت زیادہ بلند ہو گیا ہے۔ اس طرح اس دیوار نے ایک طرف بحر خزر کا ساحلی مقام بلند کر دیا تھا، دوسری طرف پہاڑ کا وہ تمام حصہ بھی روک دیا تھا جو ڈھلوان ہونے کی وجہ سے قابلِ عبور ہو سکتا تھا۔

ساحل کی طرف یہ دیوار دوہری ہے۔ یعنی اگر آزربائیجان سے ساحل ہوتے ہوئے آگے بڑھیں، تو پہلے ایک دیوار ملتی ہے جو سمندر سے برابر مغرب کی طرف چلی گئی ہے۔ اس میں پہلے ایک دروازہ تھا دروازہ سے جب گزرتے تھے تو شہر دربند آتا تھا اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔ دربند سے آگے پھر اسی طرح کی ایک دیوار ملتی ہے۔ لیکن یہ دوسری دیوار صرف دو میل تک گئی ہے اس کے بعد اکہری دیوار کا سلسلہ ہے۔

دونوں دیواریں جہاں جا کر ملی ہیں، وہاں ایک قلعہ ہے قلعہ تک پہنچ کر دونوں کا درمیانی فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں رہتا۔ لیکن ساحل کے پاس پانچ سو گز ہے، اور اسی پانچ سو گز کے عرض میں دربند آباد ہے۔ اس دہری دیوار کو ایرانی قدیم سے "دو بارہ" کہتے آئے ہیں۔ یعنی دہرا سلسلہ۔

یہ قطعی ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے۔ ساسانی عہد میں یہ مقام موجود تھا، اور اسے "دربند" کہا جاتا تھا، یعنی بند دروازہ" کیونکہ مقدسی، ہمدانی، مسعودی، اصطخری، یاقوت اور قزوینی وغیرہ تمام مسلمان مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے اسی نام سے اس کا ذکر کیا ہے اور

سدّ یاجوج

اب ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ سائرس نے جو سد تعمیر کی تھی اس کا صحیح محل کیا تھا، اور موجودہ زمانہ کے نقشہ میں اسے کہاں ڈھونڈنا چاہیئے۔؟

بحر خزر کے مغربی ساحل پر ایک قدیم شہر دربند آباد ہے، یہ ٹھیک اس مقام پر واقع ہے جہاں کاکیشیا کا سلسلہ کوہ ختم ہوتا ہے اور بحر خزر سے مل جاتا ہے۔ اس مقام پر قدیم زمانے سے ایک عریض و طویل دیوار موجود ہے، جو سمندر سے شروع ہوکر تقریباً تیس میل تک مغرب میں چلی گئی ہے، اور اس مقام تک پہنچ

اصل کاکیشین قبیلوں کی آمد و رفت کی راہ یہی تھی۔

اس مقام سے جب مغرب کی طرف، کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں اور آگے بڑھتے ہیں، تو ایک اور مقام ملتا ہے جو داریال کے نام سے مشہور ہے اور موجودہ زمانے کے نقشے میں اس کا محل ولاڈی کیوز اور تفلس کے درمیان دکھایا جاتا ہے

یہ کاکیشیا کے نہایت بلند حصوں میں ہو کر گزرا ہے اور دور تک دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں بھی قدیم زمانے سے ایک دیوار موجود ہے اور ارمنی روایتوں میں اسے "آہنی دروازہ" کے نام سے پکارا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دیوار کس نے تعمیر کی تھی؟ تمام عرب مورخوں کا بیان ہے کہ نوشیرواں نے تعمیر کی تھی۔ چنانچہ مسعودی نے اس کی تعمیر کی بعض تفصیلات بھی بیان کی ہیں اور بعد کے تمام مصنف اسے نقل کرتے آئے ہیں لیکن جب ہم قبل از اسلام عہد کے تاریخی نوشتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نوشیرواں کے عہد سے بہت پہلے یہاں ایک دیوار موجود تھی اور اس نے شمال و جنوب کا راستہ روک رکھا تھا چنانچہ سب سے پہلے پہلی صدی مسیحی میں مشہور عبرانی مورخ جوزیفس

لہ یونانی کاکیشیا روسی کیوکز اور فارسی قفقاز ایک ہی لفظ ہے۔

سب لکھتے ہیں کہ ساسانی عہد میں یہ مقام شمالی سرحد کا سب سے زیادہ اہم مقام تھا کیوں کہ اسی راہ سے شمال کے حملہ آور ایران کی طرف بڑھ سکتے تھے یہ ایرانی ممالکت کی کنجی تھی۔ جس کے ہاتھ یہ کنجی آجاتی، وہ پوری مملکت کا مالک ہو جاتا تا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اس کی حفاظت کا اس درجہ اہتمام کیا جائے۔

مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں جب یہ علاقہ فتح کیا تو ساسانیوں کی طرح انہوں نے بھی اس مقام کی اہمیت محسوس کی۔ وہ اسے "باب الابواب"[1] اور "ابواب" کے نام سے پکارنے لگے۔ کیونکہ مملکت کے لئے یہی مقام شمالی دروازہ تھا۔ جو اس دیوار کے طول میں بنائے گئے تھے۔ جنہوں نے اسے "باب الترک" اور "باب الخزر" کے نام سے بھی پکارا ہے، کیوں کہ تاتاریوں اور تاتاری

---

[1] عرب جغرافیہ نویس دربند ہی کے نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن عام نام باب ابواب پڑ گیا تھا، اس لئے عنوان کے لئے اکثروں نے باب الابواب اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ——— یاقوت نے معجم البلدان میں اس مقام کا حال "باب ابواب" ہی کے نام سے لکھا ہے۔ پس حرف "با" میں دیکھنا چاہیئے نہ کہ "ڈال" میں۔

سکندر کا انتساب

اب یہاں ایک اور الجھاؤ پڑتا ہے جوزیفس اور پروکوپیئس دونوں یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ان استحکامات کا بانی سکندر تھا۔ حالانکہ سکندر کی فتوحات کا کوئی واقعہ تاریخ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے اور کہیں سے کبھی ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس علاقہ میں آیا ہو یا یہاں کوئی جنگ کی ہو۔

زمانہ حال کے ایک امریکن مورخ مسٹر اے۔ وی ولیمس جیکسن (پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی) نے اس علاقہ کی سیاحت کی ہے اور اس کے تفصیلی

اس کا ذکر کرتا ہے۔ پھر پروکوپیئس چھٹی صدی مسیحی کے اوائل میں خود اپنا عینی مشاہدہ نقل کرتا ہے کیوں کہ ۵۲۸ مسیحی میں جب رومن بلی ساریوس نے اس علاقہ پر حملہ کیا ہے۔ تو یہ اس کے ہمراہ تھا۔ نوشیرواں کا زمانہ ۵۳۱ مسیحی سے ۵۷۹ مسیحی تک تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ استحکامات اس کے بنائے ہوئے نہیں ہو سکتے۔

کہ اس طرح کی توجیہات قابلِ اطمینان تسلیم کرلی جائیں؟

اس طرح کے غیر معمولی استحکامات جبھی تعمیر کئے جا سکتے ہیں جبکہ امن و حفاظت کی ضرورت نے انہیں ناگزیر کر دیا ہو۔ لیکن سکندر کو اپنی تمام فتوحات میں اس طرح کی کوئی ضرورت پیش ہی نہیں آئی۔ اس کے زمانے میں یہ علاقہ ایران کی قدیم شہنشاہی کے ماتحت تھا اس نے شام کی راہ سے ایران پر حملہ کیا۔ اور پھر وسط ایشیا ہوتا ہوا ہندوستان چلا گیا ہندوستان سے واپسی پر ابھی بابل ہی میں تھا کہ انتقال کر گیا۔

ایسی حالت میں وہ کون سے حالات ہو سکتے ہیں جو کاکیشیا کے استحکامات پر اسے مجبور کر سکتے تھے؟ اور اگر پیش آتے تو کب؟

اصل یہ ہے کہ یہ استحکامات سکندر سے دو سو برس پہلے سائرس نے تعمیر کئے تھے، اور درّہ داریال کی سد، وہی سد ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔

حسب ذیل وجوہ و قرائن سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔

اولاً، سائرس اور سکندر کی دو باتیں تاریخ کی قطعی روشنی میں آ چکی ہیں۔ سائرس کے زمانے میں یہاں سے سیتھین قوم کے حملے ہو رہے تھے۔ سکندر کے زمانے میں کوئی حملہ آور نہیں تھا۔ سائرس کے لئے ضروری تھا کہ یہ راہ روکے سکندر کو کوئی ایسی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سائرس کی نسبت ہیروڈوٹس اور زینوفن کی شہادت موجود ہے کہ فتح لیڈیا کے بعد سیتھین قوم کے سرحدی حملوں کی روک تھام کی۔ سکندر کی نسبت

حالات اپنے سفر نامہ [1] میں بیان کئے ہیں۔ وہ اس مشکل کا یہ حل تجویز کرتے ہیں کہ سکندر کے کسی جنرل نے یہ استحکامات تعمیر کئے ہوں گے۔ کم از کم درۂ داریال کے استحکامات بعد کو ساسانی فرمانرواؤں نے انہیں اور زیادہ وسیع اور مکمل کر دیا۔ چونکہ ابتدائی تعمیر سکندر کے عہد کی تھی اس لئے سکندر کی طرف منسوب ہو گئی [2]

لیکن جب سکندر کے تمام فوجی اعمال خود اس کے عہد میں اور خود اس کے ساتھیوں نے قلمبند کر دیئے ہیں اور ان میں کہیں بھی کاکیشیا کی لڑائی یا کاکیشیا کے استحکامات کی تعمیر کا اشارہ نہیں ملتا تو پھر کیونکر ممکن ہے

---

[1] دیکھو پروفیسر موصوف کی کتاب "فروم کونسٹنٹی نوپل ٹو دی ہوم آف عمر خیام"
From Conslenti nopal to the home of - Omar
ہم ان کی ایک دوسری تصنیف کا زردشت کے حالات میں حوالہ دے چکے ہیں۔

[2] بہت ممکن ہے کہ سکندر کی نسبت یہ خیال اس بنا پر پیدا ہو گیا ہو کہ بعد کے بعض مورخوں نے غلطی سے اس سلسلہ کوہ کا کیس نکوہ دیا ہے جو بحر خزر کے مشرق جانب واقع ہے اور جسے سکندر نے وسط ایشیا سے ہندوستان جاتے ہوئے طے کیا تھا۔ اسٹرابو نے اس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کیا یہ "گورش" کی بدلی ہوئی شکل نہیں ہے۔ جو سائرس کا اصلی نام تھا۔ جیسا کہ دارا کے کتبۂ استخر میں پڑھا جا چکا ہے؟

پروفیسر جیکسن اس ارمنی نام کا ذکر کرتے ہیں، لیکن وہ "کور" کا تلفظ "سور" کرتے ہیں، اور پھر عربی کے ایک نام "سول" کا اسے ماخذ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح لفظ کی حقیقت گم ہو جاتی ہے۔

اب ایک سوال اور غور طلب ہے۔ ذوالقرنین نے جو سد تعمیر کی تھی، وہ درہ داریال کی سد ہے، یا دربند کی دیوار؟ یا دونوں؟

قرآن میں ہے کہ ذوالقرنین دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچا، اس نے آہنی تختیوں سے کام لیا، اس نے درمیان کا حصہ پاٹ کے برابر کر دیا، اس نے پگھلا ہوا تانبا استعمال کیا تعمیر کی یہ تمام خصوصیات کسی طرح بھی دربند کی دیوار پر صادق نہیں آتیں۔ یہ پتھر کی بڑی بڑی سِلوں کی دیوار ہے اور دو پہاڑی دیواروں کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ سمندر سے پہاڑ کے بلند حصے تک چلی گئی ہے اس میں آہنی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ پس یہ قطعی ہے کہ ذوالقرنین والی سد کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔

البتہ درّہ داریال کا مقام ٹھیک ٹھیک قرآن کی تصریحات کے مطابق ہے۔ یہ دو پہاڑی چوٹیوں کے درمیان ہے۔ اور جو سد تعمیر کی گئی ہے اس کے درمیان کی راہ بالکل مسدود کر دی ہے۔ چونکہ اس کی تعمیر میں آہنی سلوں سے کام لیا گیا تھا، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جارجیا میں "آہنی دروازہ"

کوئی ایسی شہادت موجود نہیں۔ ان دو باتوں کے جمع کرنے سے جو تاریخی قرینہ پیدا ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ یہ سد سائرس نے تعمیر کی ہوگی نہ کہ سکندر کے حکم سے اس کے کسی افسر نے۔

ثانیاً۔ پروکوپئس کے علاوہ دوسرے قدیم مورخوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً "ٹسی ٹس" اور "لیڈس" یہ وہ ہیں بتلاتے ہیں کہ رومی اسے "کاسپین پورٹا" کے نام سے پکارتے تھے یعنی "باب کاسپین" لیکن اس طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے کہ یہ سکندر کے عہد کی تعمیر ہے۔

ثالثاً، ایک مثبت شہادت بھی موجود ہے جو سائرس کی طرف ذہن منتقل کردیتی ہے۔ یہ ارمنی نوشتوں کی شہادت ہے۔ جسے قرب محل کی وجہ سے مقامی شہادت تصور کرنا چاہیئے۔

ارمنی زبان میں اس کا قدیم نام "بہاک گورائی" اور "کاپان کورائی" چلا آتا ہے دونوں کا مطلب یہ ہے کہ "گور کا درہ"، [۱] سوال یہ ہے کہ "کور" سے مقصود کیا ہے؟

---

[۱] دربند نامہ ص۱۲۔ دربند کی تاریخ میں یہ ایک نہایت جامع کتاب ہے جو ۱۸۴۵ء میں ایک ترک مصنف کاظم بک نے لکھی ہے۔ یہ سینٹ پیٹرزبرگ یونیورسٹی میں ترکی و فارسی کا پروفیسر تھا، اور خود دربند کا باشندہ تھا۔ ۱۸۵۵ء میں اس کا انگریزی ترجمہ ہسٹری آف دربند کے نام سے شائع ہوا۔

دیوارِ دربند کی موجودہ حالت

روسی سیاح کی نانی ہوئی "ایچ والد" نے اپنی کتاب "کوا کیسیس" میں نقل کیا ہے۔ لیکن ۱۹۰۳ء میں جب پروفیسر جیکسن نے اس کا معائنہ کیا تو کوآثار باقی تھے۔ لیکن دیوار گر چکی تھی البتہ اکہری دیوار اکثر حصوں میں اب تک باقی ہے۔

موجودہ زمانے کے شارحین تورات میں بھی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے کہ یاجوج و ماجوج سے سیتھین قوم مراد تھی لیکن وہ حزقیل کی پیشین گوئی کا محمل ان کا وہ حملہ قرار دیتے ہیں جو ہیروڈوٹس کے قول کے مطابق ۶۳۰ قبل مسیح میں ہوا تھا۔ لیکن اس صورت میں یہ مشکل پیدا ہو جاتی ہے کہ حزقیل کی کتاب

کا نام زمانہ قدیم سے مشہور چلا آتا ہے۔ اسی کا ترجمہ ترکی میں "دامر کپو"[1] مشہور ہو گیا۔

بہر حال ذوالقرنین کی اصلی سد یہی سد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد خود اس نے یا اس کے جانشینوں نے یہ دیکھ کر کہ کیسپیا کا مشرقی ڈھلوان بھی خطرے سے خالی نہیں، دربند کی دیوار تعمیر کر دی ہو اور نوشیروان نے اسے مضبوط کیا ہو یا ممکن ہے کہ فی الحقیقت نوشیرواں ہی کی تعمیر ہو۔

---

[1] ترجمہ دربند نامہ از کاظم بیگ صفحہ ۱۲۔ پروفیسر جیکسن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور اسے قدیم ایام کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

(فرام کونسٹنٹی نوپل ٹو ہوم آف عمر خیام صفحہ نمبر ۶۱)

استدراک

(۱) ہم نے سائرس کے جس مجسمہ کا اوپر ذکر کیا ہے، اور جس سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ "ذوالقرنین" اسی کا لقب تھا، وہ قدیم سنگ تراشی کی صناعیوں کا ایک نہایت نادر نمونہ ہے اور موجودہ عہد کے تمام اہل نظر کا فیصلہ ہے یونانی سنگ تراشی کی صنعت اگر کوئی ایشیائی نمونہ رکھا جا سکتا ہے تو وہ یہی سائرس کا مرمری مجسمہ ہے۔ یہ ایران کے قدیم دارالحکومت استغر سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے وہاں دارا نے شاہی محل تعمیر کیا تھا۔ اب اس کا بقیہ صرف چند مرمری ستون رہ گئے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک مربع ستون پر یہ مجسمہ ابھارا گیا تھا۔

بابل کی اسیری کے زمانہ میں لکھی گئی ہے کیوں کہ وہ خود بھی بخت نصر دل کے اسیروں میں سے تھے۔ اور سیقلین حملہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا اس باب میں مزید تفصیلات کے لئے انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا اور جیوش انسائیکلو پیڈیا میں لفظ GOd کا مقالہ دیکھنا چاہیے۔

ہم نے ذوالقرنین کے مبحث میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے کیوں کہ زمانہ حال کے معترضین قرآن نے اس مقام کو سب سے زیادہ اپنے معاندانہ استہزا کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں، ذوالقرنین کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں ہے یہ محض عرب یہودیوں کی ایک کہانی تھی۔ جو پیغمبر اسلام نے اپنی خوش اعتقادی سے سمجھ لی اور نقل کر دی۔

اس لئے ضروری تھا کہ ایک مرتبہ یہ مسئلہ اس طرح صاف کر دیا جائے کہ شک و تردد کا کوئی پہلو باقی نہ رہے۔

کے ظہور کی خبر دی گئی ہے، وہاں یہ بھی ہے کہ:

"دیکھو، میں ایک عقاب کو پورب سے بلاتا ہوں۔ اس شخص کو جو ایک دُور کے ملک سے آکر میری ساری مرضی پوری کرے گا" (باب ۴۶: ۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح دو سینگوں کا معاملہ دانیال نبی کے مکاشفہ سے تعلق رکھتا ہے اس طرح عقاب کی تشبیہ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں آ چکی ہے خواہ یہ پیشین گوئیاں بعد کو بنائی گئی ہوں، خواہ فی الحقیقت پیشتر کی ہوں، لیکن یہ ظاہر ہو گیا کہ سائرس کے لئے دو سینگوں کا اور عقاب کا تخیل پیدا ہو چکا تھا، اور ٹھیک ٹھیک یہی تخیل ہے جو اس مجسمہ میں متشکل ہو گیا ہے۔
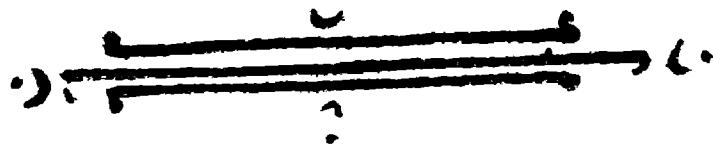
سب سے پہلے ۱۸۲۵ء میں جیمس موریہ نے اس کی موجودگی سے علمی دنیا کو روشناس کیا۔ پھر چند سال بعد سر رابرٹ کیر پورٹر نے اس مقام کی علمی پیمائش و تحقیق کر کے مفصل معلومات بہم پہنچائی اور اپنے سفرنامہ میں جارجیا و ایران میں مجسمہ کی وہ نقل بھی شائع کر دی جو اس نے پنسل سے تیار کی تھی۔
اس وقت تک قدیم پہلوی زبان اور میخی خطوط کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا تھا۔ تاہم یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ مجسمہ سائرس ہی کا ہے بعد کی تحقیقات نے مزید تصدیق کر دی۔ پھر ۱۸۸۴ء دیولافوا (Dieulafoy) نے اپنی مشہور کتاب (Land antique en perse) میں اس کا اصلی عکس شائع کر دیا اور اس طرح مجسمہ کی اصل نوعیت دنیا کے سامنے آ گئی۔

اس وقت سے لے کر یہ مجسمہ تاریخ قدیم کے مباحث کا ایک عام موضوع رہا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج تک کسی یورپین مستشرق کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا کہ اس کی نوعیت میں قرآن کے "ذوالقرنین کی صریح اور قطعی تصدیق نمایاں ہو گئی ہو۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ تغافل مذہبی تعصب کا نتیجہ ہے کیوں کہ ان میں کافی تعداد ایسے اہل علم کی ہے جو یقیناً ان تعصبات کی آلودگیوں سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں تاہم اس میں شک نہیں، یہ تغافل علم و نظر کے عجائب مستثنیات میں سے ہے۔
(۲) اس مجسمہ میں سائرس کے سر پر دو سینگ نکلے ہوئے ہیں اور اطراف میں عقاب کے سے پر۔ سینگوں کا مطلب واضح ہو چکا۔ لیکن عقاب کے سے پر کیوں بنائے گئے؟ اس کا جواب بھی ہمیں یسعیاہ نبی کے صحیفہ سے مل جاتا ہے۔ اس میں جہاں سائرس

عیدین :- از مولانا ابو الکلام آزادؒ

عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دو مختصر لیکن جامع خطبات۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے زور قلم کا ایک شاہکار جو عرصہ سے نایاب تھا اب شائع ہو گیا ہے۔

قیمت۔ -/۷ روپے

جامع الشواہد :- مولانا ابو الکلام آزادؒ

کیا غیر مسلم مسجدوں میں داخل ہو سکتے ہیں اس موضوع پر لکھی گئی مولانا ابو الکلام آزاد کی مستند جامع اور مختصر کتاب ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ قیمت۔ -/۸ روپے

ہجر و وصال :- مولانا ابو الکلام آزادؒ۔

،، البلاغ ،، کے وہ نایاب مضامین جن کی آج پھر شدید ضرورت ہے عرصہ سے نایاب تھے ایکبار پھر کتاب کی شکل میں دستیاب ہیں۔ قیمت صرف -/۵ روپے

ولادت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) از مولانا ابو الکلام آزادؒ۔

پیارے رسولؐ کی ولادت کے پیارے حالات۔ جس کے مطالعے سے ایک خاص کیف ملتا ہے، حالانکہ اس موضوع پر بہت سی تصانیف سامنے آچکی ہیں مگر مولانا ابو الکلام آزادؒ کا انداز جدا ہے۔ قیمت :- -/۸ روپے

ڈرامہ نگاری کا فن :۔ از پروفیسر محمد اسلم قریشی

اردو ڈرامہ نگاری کے فن پر پہلی مستند تصنیف جس میں ڈرامے کے فن۔
اس کی ابتداء اور ارتقاء کا تفصیلی مطالعہ اور اردو ڈرامہ کی ابتدا اس کے عہد بہ
عہد ارتقاء کا تحقیقی جائزہ ہے۔ قدیم سے جدید ڈرامے تک کی تصاویر پوری کتاب
کے بعد آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ قیمت ۳۵/- روپے

اقبال کا فلسفۂ خودی :۔ از پروفیسر محمد عثمان

پروفیسر محمد عثمان نے اقبال کے فنی کمالات اور فلسفۂ خودی پر ایک نئے انداز
نئے زاویے سے نظر ڈالی ہے۔ کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح اقبال نے
فلسفۂ خودی کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ کتاب اقبالیات پر ایک نیا
اور گرانقدر اضافہ ہے۔ قیمت ۳۰/- روپے

جدید تعلیمی نفسیات :۔ از ڈاکٹر عبد الروف۔

ڈاکٹر عبد الروف ہندو پاک کے مشہور ماہر نفسیات ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی
یہ کتاب نہ صرف جدید تعلیمی قدروں سے روشناس کراتی ہے بلکہ روزمرہ پیش آنے
والے تعلیمی مسائل۔ تعلیم کے جدید نظری اور عملی رجحانات کی نشاندہی کرتی ہے
یہ کتاب تعلیمی نفسیات کے بنیادی نوعیت کے تمام نصابوں کے لئے ناگزیر کتاب ہے
قیمت ۲۵/ روپے۔

قرآن کا قانونِ عروج و زوال :۔ از مولانا ابوالکلام آزادؒ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ ایک اچھوتی اور منفرد تصنیف ہے جس میں عروج و زوال کے فطری اصول۔ حقیقت اسلام۔ وحدتِ اجتماعیہ و عزم و استقامت وغیرہ موضوعات پر بہت عمدہ بحث کی گئی ہے قیمت /۱۵ روپے

فلسفہ :۔ از مولانا ابوالکلام آزادؒ۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے فلسفہ کے مالہ و ما علیہ پر مبسوط تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا "فلسفہ کی ایک نئی تاریخ لکھی جانی چاہیئے، یعنی ایسی تاریخ جس کے دامن پر فرسودہ نظریات کی تہیں جمی ہوئی نہ ہوں۔
زیرِ نظر کتاب مولانا کے اسی اندازِ نگارش کا بیش قیمت نمونہ ہے۔
قیمت۔/۱۰ روپے

حضرت یوسف علیہ السلام : مولانا ابوالکلام آزادؒ۔

یوں تو حضرت یوسف علیہ السلام کے حالاتِ زندگی بہت سے حضرات نے قلم بند کئے ہیں مگر موصوف نے اپنی کتاب میں ان حقائق کو بیان کیا ہے جن کی مطابقت قرآن پاک سے ہوتی ہے۔ قیمت۔/۱۰ روپے